بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان اور دکھی انسان

ملک حنیف وجدانی

(۳)

(8 اکتوبر سے پہلے کی تصویر)

دیدہ ورؔ ''اقبالؒ'' کا اعلامیہ

کس بنا شد در جہاں محتاج کس ☆ نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس

ارض حق دا ارض خود دانی بگو ☆ چیست شرحِ آیۂ ''لا تفسدوا''

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ☆ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ☆ نیست ممکن جز بقرآں زیستن

وحدتِ قیادت کا عظیم مجسمہ' قائداعظم

جنگ آزادی کی فتح' مسلم لیگ اور اردو

سیاسی انارکی' بے وفائی کا المیہ

ایک بڑے مذہبی لیڈر کی طرف سے جاگیرداری کی زبردست حمایت

''روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ''

1973ء کا آئین امیروں کے نازنخرے اور غریبی کے گھاؤ ختم نہ کر سکا

سول اور فوجی اقتدار کا اکھاڑ پچھاڑ

بھوک اور بے روزگاری سے گداگری کا کلچر عام

خیموں کی کچی آبادیاں

مینار پاکستان سے خودکشی کے روح فرسا مناظر

مزارعین کی قدامت کے گواہ! آبائی قبرستان

وہ اپنے مکانات اور اپنی آباد کردہ زمینوں سے بے دخل

محترم جے سالک کی انوکھی آواز! اور اپنے بڑے خاموش

پاکستان کا نام لے لے کر رونے والے 2 لاکھ بہاری

''قومی غیرت کوئی چیز تو ہوتی ہوگی؟''

''بلدیاتی انتخابات کا تیسرا مرحلہ مکمل 6/10/2005''

اپنائیت (Kindred) سے محروم ہر ایک اس نظام میں ایک سوالیہ نشان ہے؟

(اور پھر زلزلہ آ گیا)''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تنظیمِ ممالک اسلامیہ (OIC) کی خدمت میں

اسلام کا منتہائے مقصود اور نصب العین یہ ہے کہ تمام نوع انسان کو' آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری میں متشکل کر دیا جائے۔ اس منتہا تک پہنچنے کے لئے وہ تدریجی طریق عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کی تفصیل ہمیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صدر اول کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل امت کا آغاز نہایت مختصر پیمانے پر ایک محدود سے خطۂ زمین میں کیا۔ اگرچہ اس امت میں مختلف نسلوں اور ملکوں کے افراد شامل تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس جماعت کا بیشتر حصہ' مکہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں کے عربوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ جا کر اس جماعت کی وسعت میں اضافہ ہوا لیکن پھر بھی یہ من حیث الکل جزیرۃ العرب تک ہی محدود تھی۔ خلافت راشدہ (بالخصوص عہد فاروقیؓ) میں اس کی وسعت بہت بڑھ گئی اور ایران' شام' فلسطین' عراق' مصر تک کے علاقے اس کی حدود میں شامل ہو گئے اور اس کے ساتھ مختلف نسلوں' وطنوں' اور مذہبوں کے باوجود باشندے' اسلام لا کر اس امت کا جزو بن گئے۔ لیکن اس وسعت' کثرت اور تنوع کے باوجود' یہ امت' امت واحدہ رہی۔ اس کا مرکز مدینہ تھا اور مختلف علاقوں کی ولایات' اس مملکت کے صوبے تھے۔ چونکہ ابھی تک نظام مملکت سیکولر نہیں ہوا تھا۔۔۔ وہ دینی مملکت تھی۔۔اس لئے اس میں کوئی فرقہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس میں مختلف پولیٹیکل پارٹیوں کا وجود تھا۔۔ پولیٹیکل پارٹیوں کا تصور غیر قرآنی اور خلاف اسلام ہے۔ بالفاظ دگر' اس وقت تک یہ امت' امتِ واحدہ تھی۔

بعد میں خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہو گئی' تو امت میں فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ یاد رکھئے۔ فرقے پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب مملکت سیکولر ہو جائے۔ سیکولر نظام میں' اہمیت سیاسی استحکام کو حاصل ہوتی ہے۔ مذہب سے اسے چنداں واسطہ نہیں رہتا۔ مذہب میں دو چار چھوڑ' بہتر فرقے بھی کیوں نہ پیدا ہو جائیں سیکولر حکومت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ یعنی اس دور میں امت تو امتِ واحدہ نہ رہی' لیکن مملکت بہرحال ایک ہی رہی۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ ملک میں سیاسی خلفشار یا تفرقہ نہ پیدا ہونے پائے۔ رفتہ رفتہ مرکز ملت کمزور ہوتا گیا اور مختلف ولایات میں آزاد حکومتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ یوں امت' نہ مذہبی طور پر

واحد رہی نہ سیاسی طور پر۔ بالفاظِ دیگر' جب امت کے ہاتھ سے دین کا دامن چھوٹ گیا تو پھر نہ دین کی وحدت باقی رہی نہ دنیا کی۔ مسلمانوں میں صرف نام کا اشتراک رہ گیا یا مذہب کی بے روح رسوم اور بے جان شعائر و مناسک کا اشتراک۔ لیکن ظاہر ہے کہ نام اور مذہبی رسوم و شعائر کا اشتراک وحدت پیدا نہیں کر سکتا۔ دنیائے عیسائیت کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ساری دنیا کے عیسائی اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں اور اپنے مذہب کی رسوم میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی سلطنتیں الگ الگ ہیں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار بھی رہتی ہیں۔ ان میں اگر معاہدات بھی ہوتے ہیں تو اسی طرح جیسے کسی غیر عیسائی سلطنت کے ساتھ معاہدہ ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عیسائی سلطنت اور مسلم سلطنت ایک دوسرے کی حلیف ہوتی ہیں اور وہ دونوں کسی عیسائی یا مسلم سلطنت کے خلاف نبرد آزما۔ دنیا کے مسلمان اس وقت اس مقام پر ہیں جس مقام پر (مثلاً) عیسائی۔ لیکن عیسائیت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا کیونکہ ان کا مذہب' سیاست میں دخل ہی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس' اسلام کا اس سے کچھ بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ اِس میں مذہب اور سیاست میں ثنویت نہیں۔ اِس کا ''مذہب'' اور ''سیاست'' دونوں دین کے تابع ہیں اور دین کا اصل الاصول وحدت امت ہے۔ ہمارے صدر اول میں' اور جن حالات میں ہم اس وقت گرفتار ہیں' ان میں' ایک بنیادی فرق ہے۔ اس وقت (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) امت بھی واحد تھی اور اس کی مملکت بھی واحد اور جو شخص اسلام لاتا تھا' وہ اس امت واحدہ کا فرد بن جاتا اور مملکت واحدہ کا شہری قرار پاتا تھا لیکن آج اگر کوئی شخص اسلام لاتا ہے تو وہ امت مسلمہ کا فرد نہیں بنتا' وہ کسی نہ کسی فرقہ کا رکن بنتا ہے۔ نہ ہی وہ مملکت اسلامیہ کا شہری قرار پاتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی مسلم ملک کا شہری بنتا ہے۔ ہمارا تفرقہ اور انتشار اس وقت اس حد تک پہنچ چکا ہے۔

اس افتراق و انتشار سے وحدت امت کی طرف عملی قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مسلم ممالک اس حقیقت کا اعتراف و اعلان کریں۔ (بالفاظ دیگر اپنے اس ایمان کا اعلان کریں) کہ وہ' دین کے نقطہ نگاہ سے' اسی صورت میں مسلمان بن سکتے اور مسلمان رہ سکتے ہیں' جب امت میں وحدت ہو (ہم نے ''دین کے نقطۂ نگاہ سے'' کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ قومی نقطۂ نگاہ سے ہم سب مسلمان ہی ہیں اور اسی جہت سے موجودہ ممالک کو مسلم ممالک کہہ کر پکارا جاتا ہے) بہرحال' سب سے پہلے اس امر کا اعتراف و اعلان ضروری ہے کہ دین کا تقاضا وحدتِ امت ہے اور آج کے بعد ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ یاد رکھئے۔ جب تک ہم اس غلط فہمی یا خود فریبی میں مبتلا رہیں گے کہ اختلاف اور تفرقہ کے باوجود' ہم دین کے نقطۂ نگاہ سے بھی مسلمان قرار پا سکتے ہیں' ہمارا کوئی قدم صحیح سمت کی طرف نہیں اٹھ سکتا۔

اگلا قدم یہ ہے کہ یہ ممالک باہمی معاہدہ کریں (اسے معاہدہ کے بجائے حلف نامہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا) کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کبھی جنگ نہیں کریں گے۔ یہ قرآن کریم کا اولین مطالبہ ہے۔ سورۃ النساء میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان' دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کردے' اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہوگی۔ عذابِ عظیم اس کے لئے تیار ہوگا اور وہ سیدھا جہنم میں جائے گا (۴/۹۳) ظاہر ہے کہ جنگ میں ہزاروں مسلمان دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں عمداً قتل ہوتے ہیں' لہٰذا مسلمان ممالک کی باہمی جنگ (از روئے قرآن) دونوں ملکوں کو جہنم رسید کردیتی ہے۔ سو اس قسم کا معاہدہ (یا حلف نامہ) جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے' مسلمان ہونے اور رہنے کے لئے بنیادی شرط ہے۔ یہ معاہدہ کہ یہ ملک نہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کریں گے اور نہ ہی کسی ایسے غیر مسلم ملک کے حلیف ہوں گے جو کسی مسلم ملک کے خلاف نبرد آزما ہو' اسے سمٹائے ہوئے الفاظ میں یوں کہا جاسکے گا کہ وحدتِ امت کی طرف قدم اول یہ ہونا چاہئے کہ ان ممالک کی خارجہ پالیسی ایک ہوگی اور جب صورت یہ ہوگی کہ یہ ملک ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کرسکیں گے اور ان سب کی خارجہ پالیسی ایک ہوگی تو ظاہر ہے کہ ان کا دفاع بھی مشترک ہوگا۔

ہمارا زمانہ' عصرِ اقتصادیات کہلاتا ہے۔ اس میں فوج سے بھی زیادہ اہم اور مؤثر عنصر اقتصادی پالیسی ہے۔ مسلم ممالک میں قدرتی ذخائر بے انتہا ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ باہمی اشتراک سے ان ذخائر کو استعمالی شکل میں لایا جائے اور پھر یکساں پالیسی کے تحت طلب و رسد سے متعلق معاملات طے کئے جائیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آغاز کار کے لئے یہ ممالک اس قسم کے اقدامات کرلیں تو اس سے ان میں باہمی اتحاد کی بڑی خوش آئند صورت پیدا ہوجائے گی اور یہی اتحاد آگے چل کر وحدت کی شکل اختیار کرلے گا...... اس کے لئے قانون کی یکسانیت پہلا قدم ہوگا۔ اس وقت بیشتر مسلم ممالک ایسے ہیں جن میں سیکولر نظام رائج ہے (اگرچہ وہ زبان سے اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ مثلاً جس طرح سیکولر کو دینی بنا کر دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں) اس نظام کے تحت' ضوابط قانون کا الگ الگ ہونا فطری امر ہے۔ جن ممالک میں ''شرعی قوانین'' رائج ہیں' (ان میں (سیکولر سے بھی زیادہ) باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے کہ جنہیں شرعی قوانین کہا جاتا ہے' وہ فقہی احکام ہوتے ہیں اور فقہ مختلف فرقوں کی الگ الگ ہے۔ وحدت قوانین کی بنیادی شرط' سرچشمۂ قوانین کی وحدت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں مشترک اور واحد سرچشمۂ قوانین' قرآن مجید کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہم نے جس طرح پہلے کہا ہے کہ وحدت امت کے بغیر' ہم دینی نقطہ نگاہ سے مسلمان ہو نہیں سکتے' اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن کریم کو سرچشمۂ قوانین تسلیم کئے بغیر' ہم دعوائے اسلام کر نہیں سکتے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون (۵/۴۴) ''جو لوگ قرآن کے مطابق

فیصلے نہیں کرتے‘ انہی کو کافر کہا جاتا ہے‘‘۔ اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو وحدتِ امت اور وحدتِ سر چشمۂ قوانین‘ لازم وملزوم ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ایک بین الملی قانونی کمیشن قائم کیا جائے جو اس قسم کا ضابطۂ قوانین مرتب کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان قوانین کی عملی جزئیات میں‘ مختلف ممالک کے مقامی تقاضوں کے مطابق فرق ہوسکتا ہے لیکن بنیادی قوانین تمام ممالک میں مشترک ہوں گے۔ اس سے وحدتِ امت کا نصب العین بس ایک ہی قدم آگے رہ جائے گا۔

اور...... وہ ایک قدم ہوگا مشترکہ نصابِ تعلیم جس سے آنے والی نسلوں کے دل ونگاہ میں یک رنگی‘ اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ اس نصاب کی بنیاد‘ قرآن ہوگا۔۔۔ اور تاریخ۔ فقہ۔ روایات...... سب اس کے تابع ہوں گی۔۔۔ یہ وہ نسل ہوگی جو مختلف مسلم مملکتوں کے جداگانہ تشخص سے بلند ہوکر‘ امتِ واحدہ کی وسیع وعظیم مملکت قائم کرنے کے قابل ہوگی۔ یہ وہ مملکت ہوگی جو دین کی بنیادوں پر قائم ہوگی اور اسلام کے تقاضوں کو پورا کرسکے گی۔ ویسے تو زمانے کے تقاضے بھی الگ الگ (چھوٹی یا کمزور) مملکتوں کو باہمدگر مدغم ہونے کی طرف کشاں کشاں لا رہے ہیں لیکن ان کے اس ادغام وانضمام میں‘ اور دین کی بنیادوں پر امت واحدہ کی مملکت واحدہ میں تبدیل ہوجانے میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر ادغام محض سیاسی اتحاد ہوگا۔۔۔ وہ اتحاد جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتیٰ (۵۹/۱۴)۔ ’’تو انہیں متحد خیال کرتا ہے حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں‘‘۔ اور ثانی الذکر اتحاد وہ ہوگا جس کے متعلق کہا ہے کہ فالف بین قلوبکم (۳/۱۰۲) اس میں دل جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق وہ عملی طریق کار جو رفتہ رفتہ وحدتِ امت تک منتج ہوسکتا ہے اور جس کی طرف اسلامی ممالک کی تنظیم کی توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان اور دین اور سیاست

حنیف رامے (مرحوم) نے پرویزؔ صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو لیا تھا جس کی روئیداد انہوں نے اپنے جریدہ ماہنامہ نصرت لاہور میں شائع کرنے کے لئے مرتب کی تھی۔ آج ان کی یاد میں اس انٹرویو کو قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

حنیف: اگر کسی کو یہ یادگار نعرہ بھول نہیں گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا: ''لا الہ الا اللہ'' تو وہ شاید انکار نہ کر سکے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ لیکن پچھلے سترہ سال میں کئی مرتبہ یہ کوشش ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ کبھی کسی بڑے مصنف نے حکم لگایا کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا۔ ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کبھی کسی بڑے وکیل نے ثبوت مہیا کیا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں اسلامی قوانین کے تعین پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے، جو ایک کے نزدیک معروف ہے وہ دوسرے کے لئے منکر ہے۔ اس طرح ہم میں اندر ہی اندر ایک منافقت پرورش پاتی رہی جس کے تحت ہم نہ تو اسلام کا نام لینا چھوڑ سکے اور نہ ہم نے اس کی روشنی میں اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی راہیں تراشنے کی سبیل کی۔ پھر ایک دن آیا کہ ملک کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑ گیا۔ منافقانہ اسلامیت سے یہ علانیہ غیر اسلامیت بہتر تھی۔ لیکن جن عوام کو ساتھ ملانے کے لئے خواص نے ایک مرتبہ اسلام کا نام لیا تھا وہ ابھی اس واقعے کو نہ بھولے تھے بلکہ برسوں کی سیاسی یبوست، معاشرتی ہلچل اور معاشی استحصال کو وہ اسی امید پر برداشت کرتے آئے تھے کہ کبھی تو اس مملکت خداداد پر اس قانون کی حکومت کے دن آئیں گے جس کا اسوہ نبی کریمﷺ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے ضد کی اور اسلامیہ کا لفظ اس ملک کے نام میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

اب پچھلے دنوں ہم نے ایک انقلاب آتے دیکھا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف تو آفاق پر دشمن کی یلغار تھی اور دوسری جانب انفس میں خدا جاگ رہا تھا۔ وہ خدا جو نیٹشے کے الفاظ میں مر چکا تھا، ہمارے دل و دماغ کے گرد بادوں سے ابھر کر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہم نے اور ہمارے لشکروں نے باقاعدہ خدائے ذوالجلال کے زیر کمان اپنے غنیم سے ٹکر لی اور جرأت و جوان مردی کے تازہ و تابندہ باب لکھے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہمارے اندھوں کو بھی انسانی معاملات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین آ چکا ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت ایک لمحے کو خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے والی قوم ایک مرتبہ پھر چونک کر کروٹ بدل چکی ہے۔ اگر ہم نے اس لمحۂ بصیرت کو پہلے کی طرح ضائع کر دیا تو یہ اپنے ساتھ ظلم ہوگا۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست، معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اس در پر اور اس در پر، کبھی اس چیز کی اور کبھی اس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، پُر وسعت معانی، اس کے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لئے خدا کی وحدت آفرین رسی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہم کنار رکھتی ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دورِ حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرنِ اول میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ سب کے لئے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہو گئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے بالفاظ صریح شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔۔۔یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لئے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لئے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین اربابِ حکومت کے سپرد کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) اربابِ مذہب کی تفویض میں دے دیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں۔ اس سے اربابِ حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور اربابِ مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا ''اسلام'' الگ الگ ہو گیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آج کل کی

اصطلاح میں سیکولر فارم (Secular Form) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامت دین قرار دے دیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لئے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلام) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عائد کر دیئے گئے ہیں۔ ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابل فہم ہو سکتا ہے لیکن جب اس قسم کی باتیں قوم کے دانشمند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہوگی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرم ﷺ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سرِ نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بیں نگاہوں اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لئے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خاردار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے، لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی۔ سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آ جایا کرتا تھا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے، دین خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو، جس میں دین خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے، محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظام حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیات اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر

لیں۔قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے یہی ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔اس لئے اگر خدا کی اس کتاب عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہد نبی اکرم ﷺ میں وجہ سرفرازی انسانیت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لئے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لئے ہوئے اٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ

حسبنا کتاب اللہ۔

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی تھا وہ اجمال جس کی تفصیل قائداعظمؒ نے (۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں) ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے...... اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔''

قرآن کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام کے جن کا تعلق بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے ہے) زندگی کے مختلف تقاضوں کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امت مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔اس طرح اس امت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن پکڑے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے۔لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہوگا اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔اس کے

لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں......لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں......تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔''

قرآن کریم کا یہ انداز اس طریق کے عین مطابق ہے جسے آج کل سائنٹیفک طریق کہا جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سائنٹسٹ تجرباتی طریق سے قوانین مرتب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ سائنٹسٹ قوانین فطرت مرتب نہیں کرتے' فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے متعلق' جنہیں اساسی قوانین (Axioms) کہا جاتا ہے۔ سائنٹسٹ یہ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کس طرح دریافت ہوئے تھے۔ سائنس ان قوانین کو بطور حقیقت ثابتہ تسلیم کر کے انہیں اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتی ہے اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش آمدہ حالات پر منطبق کرتی ہے۔ سائنس کا تعلق خارجی کائنات سے ہے اور دین کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعیہ سے۔ جن قوانین کو سائنس کی دنیا میں (Axioms) کہا جاتا ہے دین کے نظام میں وہ مستقل اقدار یا وحی کے عطا کردہ اساسی اصول کہلاتے ہیں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ یہ تھا اسلام کا وہ بنیادی تصور جس کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے میری یہی کوشش رہی کہ مملکت کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے ایک طرف حکومت کا سیکولر انداز بھی ختم ہو جاتا تھا اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا وہ اقتدار بھی باقی نہ رہتا تھا جو اسے شخصی قوانین کے دائرے میں اس وقت حاصل ہے۔ اس لئے میری دعوت کی مخالفت دونوں طرف سے ہوئی۔ سیکولر نظام کے حامی تو کھل کر سامنے نہیں آ سکتے تھے لیکن مذہبی پیشوائیت کے لئے میدان وسیع تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ تو نہیں کہا (نہ ہی وہ ایسا کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتے تھے) کہ قرآن کی آمد سے ان کی تھیاکریسی ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے نازک جذبات کا سہارا لے کر یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ انکار سنت ہے' یہ (معاذ اللہ) انکار رسالت ہے۔ میں اس مقام پر اقرار و انکار سنت کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ ہمارے پیش نظر موضوع سے متعلق نہیں' لیکن اتنی بات تو حنیف صاحب! بادنیٰ تدبر واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا یہی نقشہ تھا کہ مملکت میں پبلک لاز الگ ہوں اور پرسنل لاز الگ۔ پبلک لاز حکومت کے زیر اقتدار ہوں اور پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں۔۔۔اور پھر پرسنل لاز میں ہر فرقے کا مسلک الگ الگ ہو اور اس طرح امت کے تفرقے کو مستقل سند حاصل رہے۔ اسلام کا یہی نقشہ ان حضرات کے نزدیک عین مطابق سنت ہے اور یہ نقشہ کہ قوانین

میں کسی قسم کی تفریق نہ ہو' سب کا سرچشمہ خدا کی کتاب ہو اور یہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں منطبق ہوں تاکہ امت کا تفرقہ اور انتشار ختم ہو کر اس میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے ان کے نزدیک خلاف سنت ہے' اور اس کا نام انکار رسالت ہے۔ فرمائیے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے!

بہرحال ان مخالفتوں کے علی الرغم میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ ہمارے ہاں یہ اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن کریم پر ہو گی جو تمام فرقوں کے مسلمانوں میں قدر مشترک ہے۔ جب ۱۹۶۲ء کے آئین کی ترتیب کا سوال زیر غور تھا تو حکومت کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس اصول پر خاص زور دیا تھا۔لیکن جب آئین مرتب ہو کر سامنے آیا تو اس میں ''قرآن'' کی بجائے ''اسلام'' کا لفظ لکھا تھا۔ تھیا کریسی کے حامیوں نے اسے بعد میں ''کتاب وسنت'' کے الفاظ سے بدلوالیا۔نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جس منافقت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ سیکولر نظام حکومت کے حامی دل میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ''اسلام'' ہو یا ''کتاب وسنت'' اس سے قیامت تک کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور سے ہو سکے۔ (اس لئے کہ ''اسلام'' کی طرح ''سنت'' کا مفہوم بھی ہر فرقے میں الگ الگ ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اتباع سنت کے مدعی حضرات آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا مطابق سنت ہے یا خفی آواز سے۔اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اس مسلک کی رو سے کبھی یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکے جو ان تمام حضرات کے نزدیک یکساں طور پر قابل تسلیم ہو؟) لہٰذا یہ طبقہ مطمئن ہے کہ نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے نہ مملکت اسلامی بنے گی۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس طرح ایسا ضابطۂ قوانین تا حشر مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک ''اسلامی'' کہلا سکے۔اس لئے ان کی فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے دائرے میں ان کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس سے دونوں گروہ بخوبی واقف ہیں۔لیکن سیکولر انداز کا حامی گروہ یہ کہہ چھوڑتا ہے کہ فرقوں کا اختلاف قانون سازی کی راہ میں حائل ہے اور مذہبی پیشوائیت یہ طعنہ دے چھوڑتی ہے کہ ارباب حکومت چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور ''اسلامی قوانین'' سے ان کی مراد ہوتی ہے شراب' جوئے' ریس اور زنا کی ممانعت یا عورتوں کی بے حجابی یا مردوں کے کلب اور جم خانے وغیرہ پر بندش۔یعنی وہ اخلاقی برائیاں جن کے بارے میں ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔لیکن جن امور میں ان حضرات میں باہمی اختلاف ہے ان کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔ان سے پوچھئے کہ یہ اخلاقی برائیاں قرآن کریم کی رو سے جرائم ہیں لیکن فرقہ بندی' اس کی نص صریح کے مطابق شرک ہے' آپ جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی پر تو اس قدر زور دیتے ہیں لیکن اس شرک کو ختم کرنے کے لئے

آپ کی طرف سے کبھی اشارہ تک نہیں ہوتا بلکہ اگر حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی کوشش ہوتی ہے تو آپ حضرات اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کوشش کو ناکام بنائے بغیر چین نہیں لیتے۔ مثلاً ۱۹۶۲ء کے آئین میں پرسنل لاز سے متعلق مختلف فرقوں کے الگ الگ قوانین کے تصور کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے آئین کی اس شق کو بدلوا کر اس کی جگہ فرقہ وارانہ تعبیر کی شق داخل کرالی۔

گذشتہ ستمبر کے قیامت خیز ہنگامے میں ہمارے قوم کے دل میں جو بے پناہ جذبہ پیدا ہوا ہے اور اس نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے ہیں۔ وہ نتیجہ ہیں اسلام کے ساتھ اس گہرے لگاؤ کا جو ہمارے عوام کے تحت الشعور میں خوابیدہ چلا آ رہا ہے اور جو اس قسم کے تصادمات کے وقت یک دم بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ متاع بیش بہا ہے اور اسے عمدہ تعمیری مقاصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر جو سوال ہے اس کا تعلق جذبات سے نہیں، علم و بصیرت اور تفقہ و تدبر سے ہے۔ سوال زیرِ غور یہ ہے کہ پاکستان میں وہ نظام زندگی کس طرح متشکل کیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا؟ اور ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہمارے عوام کے یہ جذبات بھی اس سے پہلے ضائع جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی متعین مقصد نہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ عوام بیچارے نہایت خلوص نیت سے یہ قربانیاں ''اسلام'' کی خاطر دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ابھی تک یہی متعین نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے ہاں ہر ذہن میں اسلام کا الگ مفہوم ہے۔ عوام کی اسلام کے ساتھ یہ محبت ایک نادیدہ محبوب کے ساتھ عشق کے مترادف ہے۔ یعنی اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری قوم کی کیفیت یہ ہے۔۔۔ دلے دارند و محبوبے ندارند۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ جذبہ لاشعوری طور پر کام کرتا ہے قوم بے پناہ قربانیاں دیتی چلی جاتی ہے اور جب وہ اس پر شعوری طور پر نگہ بازگشت ڈالتی ہے اور اپنے گرد و پیش دیکھتی ہے تو اسے کچھ اور ہی نظر آتا ہے اور یوں ان کا وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا ردعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ عوام کے اس قیمتی جذبے کو مستقل شعار بنانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم متعین کر کے اسے عملی نظام کی شکل میں متشکل کیا جائے جس کے حسین و خوشگوار نتائج اسے ان کی نگاہوں میں دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز بنا دیں اور یوں وہ اس کے تحفظ و بقا کی خاطر ہر قربانی کے لئے نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہر وقت تیار ہوں۔

باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا، ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا، تو ان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ اس سے تحریک پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائداعظمؒ کے

دشمنوں تک نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ''منافق'' تھا۔۔۔ اور منافق بھی ایسا جو حصول مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا' اسے (Exploit) کر رہا تھا۔ جدوجہد آزادی کے دس سالہ دور میں قائداعظمؒ کی تقاریر' تحریرات' بیانات' خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ اس مطالبے کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو بربنائے مذہب۔ ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں تو اس لئے کہ

> ''ہم اس میں اپنے ضابطہ حیات' ثقافتی نشوونما' روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔''

وہ واضح طور پر بتاتے رہے کہ:

> ''پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی' ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔''

جب پوچھا جاتا کہ تشکیل پاکستان سے ہوگا کیا تو وہ جواب میں کہتے:

> ''اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گذشتہ کو ازسرنو زندہ کرے گی۔''

آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ ایک دفعہ (۱۹۴۱ء) میں مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ سیاست میں مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہیں' تو اس کے جواب میں انہوں نے برملا کہا تھا کہ:

> ''میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو' مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور وشغب کے سوا رہ کیا جاتا ہے!''

قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی امتیاز کے متعلق جو کچھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں بتایا تھا اس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

ہمارے یہ پاکستانی کرم فرما کہتے ہیں کہ جناح نے اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے چپکا رکھا تھا ورنہ اس کا مقصد کسی اسلامی مملکت کا قیام نہیں تھا۔ لیکن سنئے کہ اس زمانے کے ہندو کیا سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

> ''آپ کو کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیں! نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک

یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہو گا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔''

ہندو تو قائداعظمؒ کے اسلامی نعرے کو حقیقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ہمارے یہ مسلمان بھائی اسے ''دروغ مصلحت آمیز'' سے تعبیر فرماتے ہیں!

پھر اس کا کیا جواب کہ جب پاکستان بن گیا اور (بقول معترضین) قائداعظم کے پیش نظر وہ مصلحت یا ضرورت نہ رہی جس کے تابع وہ اپنی ہر بات کے ساتھ اسلام کا نام چپکائے رکھتے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی اسلام کا نام نہ چھوڑا۔ انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اور (جو غالباً ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں انہوں نے کہا تھا:

''ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلامی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضے سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے جائے اور نوع انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔''

یہ تھی جناح کی آخری پکار جب اسے کسی 'مصلحت آمیزی' کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے شک مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی بہبود چاہتا تھا لیکن صرف قرآنی نظام کی رو سے' جس میں آج بھی یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہر اس قوم کو جو اسے اپنا مسلک زندگی قرار دے لے نہ صرف مادی سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے بلکہ شرف انسانیت کی معراج کبریٰ تک پہنچا دے۔۔۔ ''یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔''

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے ''نصرت'' کے گذشتہ شماروں میں جناب منظور قادر سے میرا ایک انٹرویو دیکھا ہو گا۔ منظور قادر صاحب نے جس نقطۂ نظر سے دین اور سیاست کے رشتے پر بات کی ہے وہ بظاہر آپ کے نقطۂ نظر کے قریب قریب برعکس ہے۔ انہوں نے اسلام کے مروجہ تصورات کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی یا معاشرتی قالبوں میں ڈھالنے سے ہمارے ہاں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن کیا ان کی یہ رائے آپ سے قریب نہیں کہ یہ فضا اسلام کے بارے میں مروجہ تصورات کی بنا پر ہے۔

پرویز: میں نے اس انٹرویو کی روئیداد ''نصرت'' میں دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس ہوا اور یہ اس لئے کہ میرے دل میں منظور قادر صاحب کی قانونی قابلیت کی بڑی قدر ہے۔ وہ

ایک بلند پایہ وکیل ہیں اور مملکت پاکستان میں وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔ نیز مغربی پاکستان کی عدلیہ کے چیف جج بھی۔ ایک وکیل اور جج کی حیثیت سے مقدمات میں ان کے سامنے ہر قسم کا رطب ویابس پیش ہوتا ہے' جھوٹے دعوے دائر کئے جاتے ہیں' جھوٹی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں اور انہیں اصل اور سچی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ منظور قادر صاحب کا منصب یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور جعلی کو اصلی سے الگ کریں اور پھر پیش نظر مقدمے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچیں۔ مجھے افسوس اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے مقدمات تک میں تو وہ اس طریق کار کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے ''اسلام کا مقدمہ'' پیش ہوا تو انہوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جو باتیں اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کے سامنے پیش کی گئیں اسے انہوں نے عین اسلام قرار دے دیا اور پھر اس کے خلاف ڈگری صادر کر دی۔ انہوں نے خدا' رسول' وحی' عبادت' گناہ' ثواب' توبہ' صدقہ وغیرہ کے خلاف اپنے اعتراضات کی بنیاد ان باتوں پر رکھی جو' معاف فرمایئے' ہمارے ہاں داستاں سرا واعظوں اور قصہ گو خطیبوں کے یہاں یا پکی روٹی جیسی کتابوں میں لکھی ملتی ہیں۔

حنیف: پرویز صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد اسی اسلام سے واقف ہیں جو پکی روٹی اور واعظوں کے خطبوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اگر منظور قادر صاحب نے کہا ہے کہ اسلام کی مروجہ شکلیں اس لائق نہیں کہ ان سے وہ نتائج پیدا ہوسکیں جن کی ہمیں آرزو ہے تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ منظور قادر صاحب خود بھی اکثر مروجہ عقائد سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

پرویزؔ: اگر منظور قادر صاحب یہ فرما دیتے کہ ان کے اعتراضات ان عقائد' تصورات اور رسومات کے خلاف ہیں جنہیں آج کل اسلام کے نام سے موسوم کر کے پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تنقید حق بجانب ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں کچھ نرم سی تصور کی جاتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ۔۔۔ بالارادہ یا بلا ارادہ' وہ حقیقی اسلام کے بعض بنیادی تصورات تک کو بھی اپنی تنقید کی زد میں لے آئے ہیں اور اس تنقید کی بنیاد وہ عقائد و تصورات ہیں جو ہمارے ہاں بلاسند و تحقیق متوارث چلے آرہے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی تئیس سالہ زندگی میں جو جو واقعات سامنے آئے قرآن نے ان کے متعلق ہدایت دی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اس تئیس سال کے عرصے میں محدود واقعات ہی سامنے آسکتے تھے' سب کے سب نہیں۔ نیز نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد واقعات کا سلسلہ ختم نہیں ہوگیا' ہر نئے دن نت نئے واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن میں دی ہوئی راہنمائی اس زمانے کے لئے تو کافی ہوسکتی تھی' یہ نہ تو ابدی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ایسی مکمل کہ گذشتہ' موجودہ اور آنے والے تمام واقعات و حوادث کو محیط ہو سکے۔ یہ تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور (جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے) مبنی ہے ''شان نزول'' کے نظریئے پر۔ لیکن اگر موصوف

''مروجہ اسلام'' سے قطع نظر کر کے خود قرآن کریم پر غور فرما لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ''شانِ نزول'' کا نظریہ خود قرآنی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ قرآن کریم اس کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ یہ وہی دین ہے جسے خدا نے نوحؑ کو دیا۔ ابراہیمؑ کو دیا۔ موسیٰؑ کو دیا' عیسیٰؑ کو دیا' تمام سابقہ انبیاء (علیہم السلام) کو دیا۔ سو جو دین روزِ اول سے چلا آ رہا تھا اس کے متعلق یہ کہنا دین کی حقیقت سے بے گانگی کی دلیل ہے کہ وہ مجموعہ ہے ان ہدایات کا جو ان واقعات کے پیشِ نظر دی گئیں جو رسول اللہﷺ کی زندگی میں اور اس معاشرے میں پیش آئیں اور بس اور پھر جس دین کے متعلق قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول اللہﷺ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو محیط نہیں ہو سکتا' قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔

قرآن کریم میں دی ہوئی ہدایات کے متعلق منظور قادر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ (Trial and Error) کے تجرباتی طریق کا نتیجہ تھیں' وحی کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے (Trial and Error) عقلِ انسانی کا طریق ہے جو مستقبل کا علم نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس وحی ہے جو عقلِ انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کا علم حدود فراموش ہے۔ لہٰذا اسے عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منظور قادر صاحب کے اس دعوے کی بنیاد ''ناسخ و منسوخ'' کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ عقیدہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔

اس کے لئے بطور مثال انہوں نے شراب کی ممانعت سے متعلق قرآنی احکام پیش کر کے فرمایا کہ دیکھئے! یہ احکام کس طرح بتدریج آئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ (Trial and Error) کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت اتنی فرصت نہیں کہ میں شانِ نزول یا ناسخ و منسوخ جیسے نظریات پر تفصیلی بحث کروں' نہ ہی اس کا تعلق آپ کے سوال سے ہے' البتہ ممانعتِ خمر سے متعلق احکام والی مثال کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تدریجی احکام (Trial and Error) کے استقرائی طریق کا نتیجہ نہیں تھے' اس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ افراد میں جو برائیاں اس طرح زمین گیر ہو چکی ہوں کہ ان کا ایک دم استیصال طبعی طور پر ناممکن ہو ان کی اصلاح بتدریج کرنی چاہئے۔ شراب جس شخص کی گھٹی میں پڑ چکی ہو اس کے لئے اس کا یک لخت چھوڑ دینا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس کی یہ عادت بتدریج چھڑانی چاہئے۔ یہ تھی مصلحت اس قسم کے احکام کو بتدریج نافذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں شراب کو بند کرنا ہو تو اس کے لئے قرآن کریم کا تجویز کردہ تدریجی طریق ہی اختیار کرنا ہو گا۔

حنیف: پرویز صاحب! مہربانی سے ذرا دو ایک مثالوں سے واضح کریں کہ قرآن حکیم اپنے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی' معاشرتی اور معاشی تقاضوں سے کیونکر عہدہ برا

ہوتا ہے۔

پرویز: جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے قرآن کریم کے ابدی اصول اس چار دیواری (Boundary Lines) کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر زمانے میں عملی پروگرام خود وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ (وامرھم شوریٰ بینھم) ''امت مسلمہ کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اصولی حکم بھی دے دیا کہ (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون) ''جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں۔'' ان اصولی ہدایات کے پیش نظر ہمارا طریق کار یہ ہوگا کہ جو معاملہ ہمارے سامنے آئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس راہنمائی کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے یہ طے کیا جائے کہ اس معاملہ کے متعلق ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس باہمی مشورے کا طریق عمل کیا ہوگا' یہ حالات کے ساتھ بدلتا جائے گا۔۔۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں جب وسائل رسل و رسائل محدود تھے' اور طریق تھا۔ آج اس کا طریق اور ہوگا۔ مشاورتی نظام کا اصول غیر متبدل رہے گا۔ البتہ اس نظام کی عملی شکل حسب ضرورت بدلتی جائے گی۔ یا مثلاً قرآن کریم کی اصولی راہنمائی یہ ہے کہ تمام افراد اور ان کی اولاد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی نظامِ معاشرہ کے ذمے ہوگی۔ (نحن نرزقکم و ایاھم)۔ اب یہ کام نظام معاشرہ کا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرے کہ معاشی نظام کی ہیئت کیا ہو جس کی رو سے کوئی فردِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی اور سامان نشو و نما سے محروم نہ رہے۔ اس نظام کی شکلیں حسب ضرورت بدلتی جائیں گی۔ لیکن یہ اصولی مقصد اپنی جگہ قائم رہے گا۔

حنیف: شراب کی حرمت پر بات کرتے ہوئے آپ نے بعض معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے قرآن کے تدریجی طریق کار کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک ضمنی سوال کا موقع نہیں کھونا چاہتا۔ قرآن کریم میں معاشرتی جرائم کے لئے سزائیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً چوری کے سلسلے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی انتہائی سزا ہے نہ کہ ابتدائی۔ کیا حرمت شراب کی طرح سزاؤں کے سلسلے میں بھی منزل بہ منزل چلنے کا حکم نہیں۔ اور کیا منزل بہ منزل چلنا اس لئے ضروری نہیں کہ جرائم کا معاشرتی نظام کے حالات سے اٹوٹ تعلق ہے۔ یہ تو دھاندلی ہوگی کہ معاشرتی حالات تو بے شک غیر اسلامی ہوں اور سزائیں اسلامی دینی شروع کر دی جائیں۔

پرویز: آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآن کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں۔ لیکن اس سے کم تر یا تدریجی سزائیں اس نے خود متعین نہیں کیں۔ اسے اس نے حالات کے مطابق نظام معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت متعدد حالات و کوائف کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔۔ مثلاً معاشرے کی عام اخلاقی سطح'

معاشی حالات کے تقاضے' خود ملزم (یا مجرم) کی نفسیاتی کیفیت' اس کی تعلیم و تربیت اور ماحول وعواطف کے اثرات وغیرہ۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ قرآن کریم نے لونڈیوں کے لئے زنا کی سزا آزاد عورتوں سے نصف مقرر کی ہے اور اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھا لینے کی بھی اجازت ہے جو عام حالات میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو کوئی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر خوراک کی چوری کی تھی بلکہ سزا ان کے مالکوں کو دی تھی کہ ان کے جرم کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے تو یہ کیوں چوری کرنے پر مجبور ہوتے! لہٰذا غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی سزائیں اَن مِل بے جوڑ سی بات ہے۔ اسلام کے اصول واحکام' مؤکدات و تنبیہات' اوامر و نواہی' فرائض و واجبات' حقوق اور ذمہ داریاں اسلامی نظام معاشرہ کے مختلف پرزے ہیں۔ یہ اسلامی نظام کے اندر اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام نہ ہو تو ان کی کیفیت ایک مشینری کے بکھرے ہوئے پرزوں کی سی رہ جاتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ (فادخلوا فی السلم کافۃ) ''تم اس نظام خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' اور اس کے برعکس سختی سے کہا ہے کہ ''کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا میں ذلت وخواری نصیب ہوگی اور آخرت میں عذاب شدید۔'' (البقرہ:۸۵)۔

لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم اپنی موجودہ سطح سے ابتدا کریں گے تو اس معاشرے کے انتہائی نقطے تک بتدریج پہنچیں گے۔ اس نسبت سے ہمیں جرائم اور ان کی سزاؤں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ سزا تو ایک طرف' حضرت عمرؓ نے ایک ذمی کا یہ کہہ کر ٹیکس واپس کر دیا تھا کہ تم ابھی حال ہی میں اس حکومت کے زیر حفاظت آئے ہو' اس نے تمہارے لئے کیا کیا ہے جو تم اس کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے آ گئے ہو!

باقی رہا دین اور سیاست کا اٹوٹ رشتہ' سو اس کے متعلق بھی ہمارے یہ معترضین ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس تعلق کی وضاحت ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ایک اصولی حکم دیا گیا ہے کہ (لا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا) ''کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔'' یہ ہمارا دین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی حالت میں اور کسی قوم کے سلسلے میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی وقت اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں مجرم قرار پاتا ہے۔ اور اگر (معاذ اللہ) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس اصول کو نہیں مانتا تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ دین جسے سیاست سے الگ کر دیا جائے ''تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ اس کے برعکس وہ سیاست ہے جس میں ہر معاملے کا فیصلہ ''مصلحت'' پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نہ کوئی غیر متبدل

اصول ہوتے ہیں نہ اٹل ضوابط۔ ''مصلحت'' کے مطابق اصول وضوابط مرتب ہوتے ہیں اور مصلحت ہی کے مطابق ان میں رد وبدل کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جس سے دنیا اس قدر مادی ترقی کے باوجود جہنم بن رہی ہے۔

حنیف: جب ہم عمل کے میدان میں دین اور سیاست کے رشتے کی کڑیاں تلاش کرتے ہیں تو اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو زیر بحث لانا لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اچھائی کا حامل اسلام جمہوریت کی خوبیوں سے بھی متصف ہے۔۔۔ اسلام کے دامن میں جمہوریت کی خوبی باہمی مشورے کے حکم کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کے مروجہ نظام کا تعلق ہے سیاسی جماعتوں کے بغیر اس کا تصور بھی لوگوں کے لئے محال ہے اور ادھر اسلام ہے کہ وہ کسی قسم کے تفرقے یا پارٹی بازی کا متحمل نہیں۔ اس صورت میں آپ کے نزدیک ہمارے دین اور ہماری سیاست کے درمیان کون سا مقام اتصال ہے جہاں جمہوریت سے وابستگی کا شوق بھی پورا ہو سکے اور وہ راہ بھی ہم سے نہ چھوٹے جو خدا نے سورہ المائدہ میں اسلام کے نام سے ہمارے لئے چنی تھی۔

پرویز: حنیف صاحب! جس طرح اسلام ایک اصطلاح ہے اسی طرح موجودہ سیاست میں جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ان مباحث کے متعلق صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ متعین طور پر معلوم کر لیں کہ قرآن کریم کی رو سے ''اسلام'' کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ متعین ہو جائے تو اس کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہو گا کہ ''جمہوریت'' کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پیشِ نظر سوال پر غور کیا جا سکے۔

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی اصطلاح بہت مبہم ہو چکی ہے اور اس کا آپ کے نزدیک یہ حل ہے کہ ہم قرآن حکیم کو اپنے لئے حکم سمجھیں' اس سے ہمیں ایک ایسا نقطہ یا مرکز مل جائے گا جس پر حسن اتفاق سے سب کا ایمان ہے اور جس پر تاریخ نے کوئی تحریفی اثر نہیں ڈالا۔ لیکن باوجود اس خواہش کے کہ میں اس مقام پر آپ کو کسی اختلافی بحث میں نہیں الجھانا چاہتا مجھے یہ کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی جسے خود قرآن کریم نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ایک حد تک ہمارے لئے اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر دیا ہے' قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصطلاح پر روشنی نہیں ڈالتی؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کے بارے میں بھی اگر ہمیں قرآن ہی سے روشنی مل جاتی ہے تو پھر حکم تو قرآن ہی ٹھہرا۔ لیکن کیا ایک جیتا جاگتا رسول' ایک عبد اور بشر' ایک سربراہ مملکت' ایک سپہ سالار' وحی کا حامل' وحی کا مبلغ اور وحی کا نافذ کرنے والا ایک نبی اسلام کا ایک بنیادی ستون نہیں؟ اور کیا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ مل کر اسلام کے تصور کو معین اور واضح نہیں کر دیتے؟

پرویز: قرآن حکیم کی رو سے رسول کا فریضہ محض ایک ایلچی یا ڈاکیہ کا نہیں ہوتا کہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیا اور

بس۔ اس کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے ایک معاشرہ متشکل کرے اور یوں دنیا کو دکھا دے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے نبی کریمﷺ کی حیات طیبہ کا اہم ترین حصہ اپنے دامن میں ابدی طور پر محفوظ کر دیا تا کہ آنے والے انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضورؐ نے قرآن کریم کے الفاظ میں اپنے بشر ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا جس سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ حضورؐ یہ کچھ ایک نبی کی حیثیت سے نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اگر یہ کچھ ایک نبی ہی کر سکتا تھا تو پھر حضورﷺ کی سیرت نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہیں پا سکتی تھی۔

پھر قرآن کریم نے خود نبی اکرمﷺ کو یہ حکم دیا تھا کہ: مشاورھم فی الامر۔ معاملات میں اپنی امت کے افراد کے ساتھ مشورہ کیا کرو اور یہ ظاہر ہے کہ جماعت مومنین کے یہ افراد انسان ہی تھے، فوق البشر نہیں تھے۔ لہٰذا قرآن کریم کے پیش کردہ نقشے کے مطابق اسلام کا جو نظام محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کر کے دکھایا وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے والے افراد کا کارنامہ تھا اور یہی چیز ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے۔ بنابریں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے، اس کا تو خود قرآن نے حکم دیا ہے۔ قرآن کریم میں اسلام کا تصور مکمل طور پر موجود ہے لیکن حروف کی شکل میں۔ اس تصور کو عملی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ تصور اپنی جگہ مکمل، واضح اور غیر متبدل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر عمل اپنے اپنے زمانے میں ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں جو آج بھی قائم ہو سکتی ہے۔

اب میں آپ کے اصلی سوال کی طرف آتا ہوں۔

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام سے مفہوم ہے زندگی کا وہ عملی نظام جو قرآن کریم میں دیئے ہوئے نقشے کے مطابق متشکل ہو۔ اب لیجئے ''جمہوریت'' کو، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اس اصطلاح کو اس شدومد سے استعمال کرتے ہیں ان کے پیش نظر جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کی مشینری ہوتی ہے۔ جمہوریت کی مغربی اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ

قانون سازی کا مطلق حق قوم کو حاصل ہے۔

اور اس کی مشینری سے مراد ہے وہ طریق کار جس کے مطابق قوم اپنا یہ حق استعمال کرتی ہے۔ مثلاً طریق انتخاب، پارلیمانی یا صدارتی نظام، حزب موافق ومخالف کا وجود، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مغربی جمہوریت کے مندرجہ بالا اصول کا تعلق ہے یہ اسلام کے اصول حکمرانی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ نہ سلطان کو، نہ کسی ڈکٹیٹر کو نہ قوم کو، نہ اس کے نمائندگان کو، نہ پارلیمان کو، نہ صدر مملکت کو۔ یہ حق ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں اور جن میں ردوبدل کا اختیار کسی

کو بھی حاصل نہیں۔ جو قانون ان اصولوں سے ٹکرائے گا' وہ قوم کے نمائندگان کی کثرت آراء سے تو ایک طرف' اگر ساری قوم کے اتفاق رائے سے بھی مرتب ہوا ہوگا تو بھی اسلامی نظام میں مردود قرار پائے گا۔

اب رہا جمہوری مشینری کا سوال۔ سو اس کی جزئیات میں سے جو شق قرآنی تعلیم سے متصادم نہیں ہوگی اسے اختیار کیا جا سکے گا۔ جو اس کے خلاف ہوگی اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک (الروم:۳۱) اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاست فرعونی کی ایجاد (القصص:۴)۔ لہٰذا امت کی مجلس مشاورت میں حزب اقتدار اور حزب مخالف کا وجود قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلے میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کے مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔ قرآن کریم میں انہی دو گروہوں کا ذکر ہے۔

امت اپنے منتخب افراد پر مشتمل مجلس مشاورت (پارلیمان) مرتب کرے گی تاکہ وہ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ قرآن کریم کے قوانین کو عملاً کس طرح نافذ کیا جائے۔ یہ ان تمام افراد کا مشترکہ مقصد زندگی ہوگا اس لئے اس میں پارٹیوں کا سوال کیا؟ پیش آمدہ معاملے کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کرے گا۔ ان آراء میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس اختلاف کے معنی ہیں معاملے کے مختلف گوشوں کا سامنے آنا تاکہ فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد جو فیصلہ ہوگا اس کی عملی تنفیذ اس پوری جماعت کا متحدہ فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں نہ کسی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے نہ ان کے سامنے مختلف اصول ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر جماعت مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے۔ اقتدار قرآن کا اور اس کی عملی تشکیل کی ذمہ دار پوری کی پوری جماعت مومنین کی۔ یہ ہے ''اسلامی نظام جمہوریت''۔

حنیف: پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے۔ جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لئے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز: جب میں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں دیکھا کہ امت میں سیاسی پارٹیوں' یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو

میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اس لئے کہ میرے نزدیک قرون اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی معین کردہ منزل کی طرف اٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اوپر تک اٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیہ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصے کو صحیح مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ جس حصے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج حاصل ہو جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری نصیب ہو گی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کی تنظیم کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ ''پارٹی ساز جمہوریت'' کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں، حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں، یعنی وہ نظام جس کے لئے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا۔۔۔ تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً نافذ کرنا ہو گا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہئے تا کہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی۔۔۔ یہ منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز۔۔ تو عذاب الیم ہے۔ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرز زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے، اگرچہ وہ نتائج بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے۔ لیکن منافقت کو، جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو، اس نے بدترین طرز زندگی قرار دیا ہے اسی لئے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معین کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔

حنیف: نارتھروپ نے اپنی تازہ کتاب ''فلسفیانہ انسانیت اور سیاست حاضرہ'' میں کلکھون اور ساروکن کی تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین اور عمل

کے قالب ان کے فلسفۂ حیات سے پھوٹتے ہیں۔ خواہ وہ شعوری طور پر اس فلسفے سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ ہر قوم زندگی کے تجربات کو تصورات میں ڈھالتی ہے اور یہی تصورات اس کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی اداروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے قرآن عظیم کی صورت میں کائنات، انسان اور ملت اسلامیہ کے بارے میں واضح تصورات موجود تھے۔ لیکن جب ہم اپنے سیاسی، معاشرتی اور معاشی قالبوں کو دیکھتے ہیں تو یا قرآن کی تعلیم پر شک گزرتا ہے یا یہ خیال آتا ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگ بڑے خلوص کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ اسلام کی مروجہ تعلیم اور اس کے تحت قائم ہونے والا تصور ذات باری، تصور دعاء، تصور انصاف ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اس سے جو حالتیں ابھر سکتی تھیں وہ ابھر چکی ہیں اور اگر ہمیں بہتر نتائج کی توقع ہے تو ہمیں اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے تصورات پر نظر ڈالنی ہوگی کہ وہ کس حد تک صحیح بنیادوں پر استوار ہے؟

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر ہم نے قرآن کی تعلیم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے تو کیا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چلتے ہوئے ہم اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں ہمارے بنیادی تصورات کا سرچشمہ قرآن قرار پائے اور کیا یہ راستہ لازمی طور پر ان پتھروں سے پٹا ہوا ہے جو ہم گالیوں اور کفر کے فتووں کی صورت میں ہر مصلح دین پر اٹھاتے رہے ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ ہم نے یہاں سرسیدؒ اور اقبالؒ کو بھی اس انعام سے نوازا۔

پرویز: یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس سے کسی قوم کا تمدن اور کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغام مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ میں صاحب ضرب کلیم کا حریف نہیں ہو سکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو تو اس طرح رہنے دیتی ہے لیکن ان کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن درحقیقت وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ہماری پوزیشن اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور ان کا مفہوم بھی خود ہی معین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام اتنا ہے کہ ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے معین کر لیں اور ان کے غیر قرآنی مفہوم کو

جھٹک کر الگ کر دیں۔ اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر سے وہ توانائی عطا کر دیں گے جو نہ صرف ہمیں خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دے گی۔

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ مفاد پرست گروہ چاہتے ہی نہیں کہ ایسا ہو اس لئے وہ مذہب پرستی کے لبادے میں ہر ایسی کوشش سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے کفر کے فتوؤں سے نوازتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی تصورات کو ایک چلا ہوا کارتوس قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اسلامی تصورات نہیں بلکہ مفاد پرست گروہوں کے تراشیدہ تصورات ہوتے ہیں جن پر اسلامی ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ اگر ان کے سامنے دین کے اصلی تصورات اور ان کا صحیح مفہوم آ جائے تو وہ دیکھیں گے کہ یہ تصورات کس قسم کا حیات بخش نظام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے سب سے بنیادی تصور لا الٰہ الا اللہ کو لیجئے۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اسے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ یہ تصور جس قدر عظیم انقلاب کی بنیاد ہو سکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ''الٰہ'' کے معنی پرستیدہ اور عبادت کے معنی پرستش کر لئے جائیں تو اس سے جذبات کی حد تک تو ہم تسکین پا سکتے ہیں، اس تصور کا عملی طور پر زندگی سے کوئی واضح تعلق نہیں رہتا۔ قرآن کا کام درحقیقت مذہب کے تراشیدہ تصورات کو خدا کے عطا کردہ تصورات سے بدلنے کا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم ان پتھروں سے بھی بچ جائیں جن سے ہر مصلح کا راستہ پٹا پڑا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ تصورات کو قرآنی تصورات سے بھی بدل دیں۔

میرے عزیز بھائی! میرے نزدیک، یا یوں کہئے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا کے ہر فرعون، ہر ہامان اور ہر قارون سے جنگ مول لینا ہے۔ اور یہ جنگ ایسی ہے جس میں مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ہم لا الٰہ نہیں کہتے الا اللہ پر آ ہی نہیں سکتے۔ یہی انبیاء کا راستہ تھا اور یہی راستہ ہر اس شخص کو اختیار کرنا ہو گا جو اس قسم کا ارادہ رکھتا ہے۔ لا الٰہ میں ہر غیر خداوندی بت کو پاش پاش کرنا ہو گا اور ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پجاری اپنے معبودوں کو نیست و نابود ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایک جگہ کہا ہے:

''کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ کچھ پیش نہ آئے گا جو تم سے پہلوں کو پیش آیا۔ انہیں مصائب و آلام نے گھیر لیا اور وہ طوفانِ حوادث میں یوں تھپیڑے کھاتے رہے کہ نبی اور اس کے رفقاء پکار اٹھے کہ اے اللہ! تیری نصرت کب آئے گی۔'' (البقرہ:۲۱۴)۔

خداوند کریم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح

کے ذکر کا جو التزام برتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے آزمائش و ابتلاء کو مومن کی زندگی کا لازمہ گردانا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ درد پیدا ہوا کہ ہم نے اسلام کی آسان تعلیم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے انہوں نے میرے خیال میں یہ احتیاط نہیں برتی کہ کہیں اس شوقِ تسہیل (Over Simplification) کے فطری نتیجے کے باعث اپنے مقتدیوں کو اس راہ پر ڈال دیں کہ وہ راہِ حق ہی کو آسان سمجھ بیٹھیں۔ تعلیم کے بارے میں تو قرآن نے خود بہت تاکید سے اپنے یسر یا آسان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے عمل کی کٹھنائیاں تو کم نہیں ہو جاتیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ تعلیم کو مشکل بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سلسلے میں۔۔۔ (Over Simplification) بھی اسلام کے ساتھ زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسے گھرانوں کو اسلامی شعائر کی بڑے اعتماد سے توہین کرتے دیکھا جس میں قرآن کے یسر ہونے کا غلط تصور پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں صوم وصلوٰۃ جیسے احکامات میں وقت کا اور خیرات میں مال کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ ادھر عملی سطح پر وہ دو تقریریں اور چار پمفلٹ پڑھ کر اسے تدبر اور تعقل کی معراج سمجھتے ہوئے دوسرے تمام مسلمانوں کو بے علم بلکہ گمراہ گردانے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالت کچھ ایسی ہے جیسے ایک نسل پیشتر ان لوگوں کی تھی جو کمیونزم سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ لوگ بحث تو مارکس کا نام لے لے کر کرتے تھے حالانکہ داس کیپیٹال کے درشن بھی انہیں نصیب نہ ہوئے تھے مگر نقدِ علم کمیونزم پر چند مفت بٹنے والے کتابچوں پر مبنی تھا۔

پرویز: غلط روش پر چلنے والی قومیں ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھلاتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں پہلے قرآن کریم کو ایسا مشکل بتایا گیا کہ اس کا سمجھنا ''گیت ودیا'' سے کم مشکل نہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت حصولِ ثواب کے لئے کافی سمجھ لی گئی اور حصولِ جنت کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اس کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ ''جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے''۔ (ابوداؤد)۔ اور طاعون یا اسہال سے یا ڈوب کر مرنے سے شہادت کا درجہ عطا ہو جاتا ہے (نسائی)۔ اب جھولا نیچے آیا تو قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے اتنے سے غور و فکر کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی جتنی مثلاً شیکسپیئر کے سمجھنے کے لئے۔ باقی رہا عمل سو اس کے لئے یہ برہموسماجی عقیدہ اپنا لیا گیا کہ اصل بات ''نیک عملی'' ہے۔ جس عمل کو کوئی نیک سمجھے اسے کر لیا کرے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔

دین ایک عالمگیر انقلاب کا داعی ہے جس کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینی ناگزیر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی ہی مجاہدانہ حرارت کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کے صحیح انقلاب آفرین تصورات واضح اور معین شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اسے بتا دیا جائے کہ اس راہ میں کتنے خطرناک

مقامات آتے ہیں لیکن اس کی منزل کس قدر حسین اور تابندہ ہے۔اس کے بعد افرادِ معاشرہ سے کہہ دیا جائے کہ یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنے لئے فیصلہ کیجئے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے گی یا نہیں۔ یونہی سراب آسا تخیلات کے ماتحت زندگی بسر کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دیجئے نہ دین کو۔ نہ خود ذلیل ہو جیئے نہ اسلام کو بدنام کیجئے۔

حنیف: پرویز صاحب! میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ نے برسہا برس تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اور اپنے درس کے سلسلے کی وساطت سے لوگوں کے سامنے اپنے خیال کے مطابق دینی تصورات کی صحیح شکل رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ کی اس کوشش نے' کہ دین کے اس بنیادی تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے' بعض لوگوں میں یہ جھوٹا اعتماد پیدا کر دیا ہے گویا وہ اسلام کی کنہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کیا آپ کے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے چند پمفلٹ پڑھ کر یا چند تقریریں سن کر اور ان سے متاثر ہو کر بعض لوگ اپنے ہمسایوں سے اس انداز میں بحث مباحثہ کرنے چل دیتے ہیں کہ انہوں نے تو دین کی روح کو پا لیا ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں نے شروع ہی سے اس قسم کے خدشات کو بھانپ لیا تھا اور اسی لئے میں نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی۔ میں اپنی قرآنی فکر کو فضا میں بکھیرتا چلا جاتا ہوں اور اس سے مختلف مقامات پر مختلف نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف قارئین اور سامعین کے اختلاف مقاصد کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں کا مقصد اپنی پندار (اَنا) کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے میری تعلیم سے ایسی باتیں لے لیں جن سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے ہم عصروں پر اپنے علم وفضیلت کی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا' یہ انہوں نے پا لیا۔ لیکن اس گروہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے اندر میری فکر نے طالب علمانہ جذبے کو ابھارا ہے۔ وہ حقائق کو ازخود سمجھنے کے لئے انتہائی محنت کرتے ہیں لیکن ان کے طالب علمانہ عجز کا یہ عالم ہے کہ ان پر نیوٹن کے اس مقولے کا اطلاق ہوتا ہے:

''ہم علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپیاں
اور گھونگے چن رہے ہیں۔''

لیکن میری کوششوں کا حاصل اس سے بڑھ کر ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اب فضا میں قرآن کی آواز عام ہو رہی ہے حتیٰ کہ اپنے تو ایک طرف' مجھے گالیاں دینے والے بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنے سامعین کے سامنے کچھ خدا لگتی باتیں کیا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی ایک اچھے انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

حنیف: پرویز صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں بہت گہرے اور ہمہ گیر معانی پائے جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر بعض تصورات کی حد تک روایتی توجیہات بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں صلوٰۃ کا ہرگز اتنا مفہوم نہیں ہے کہ چند رکعت نماز ادا کر لی جائے لیکن جب صلوٰۃ کے وسیع تر

معانی پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دو رکعت والی نماز سے انسان بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا آپ کے فکر نے بھی بعض اس طرح کے نتائج پیدا نہیں کیئے؟

پرویز: حنیف صاحب! دین میرے نزدیک زندگی کے ایک عملی نظام کا نام ہے اور جہاں تک ان ارکان اسلام کا تعلق ہے جن کی سند قرآن کریم سے ملتی ہے وہ اس نظام کے ستون ہیں' یا یوں کہیئے کہ اس کے پروگرام کے لاینفک اجزا ہیں۔ اگر وہ دین کے نظام کے تحت ادا ہوں تو ان کے حسین نتائج سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہے تو پھر ارکان کی شکل وصورت تو باقی رہ جاتی ہے' ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ میرا پیغام یہ ہے کہ ان ارکان کو پھر سے دین کا جز بنایا جائے تا کہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں موجودہ حالات میں بھی' جب کہ وہ نظام موجود نہیں' ان ارکان کو اسی شکل میں قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اس کی تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم میں جب بھی احساس زیاں بیدار ہوا' انہی ارکان کے ''حشر اجساد'' سے ہمیں حیات نو عطا ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کرتا تو اس پر میرا کوئی جبر نہیں۔ حقیقت یہ ہے حنیف صاحب! میں نے اپنی پوزیشن صرف ایک مبلغ کی رکھی ہے' داعی یا کسی جماعت کے امام کی نہیں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس سے بھی متفق نہیں ہوسکتا کہ چونکہ دین کے صحیح تصورات پیش کرنے سے لوگوں کی نظروں میں ان بے روح رسومات کی اہمیت کم ہونے کا خدشہ ہے اس لئے دین کی صحیح شکل سامنے لانی ہی نہیں چاہئے۔ میرے ''حلقۂ سخن'' میں ایسے ارباب فکر وعمل بھی موجود ہیں جو ان ارکان کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ جب یہ ارکان اسلام کے نظام کے اجزا بنے تو ان سے کس قدر خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایمان کو عمل پر اولیت دی ہے۔ عمل کی اہمیت کو اس نے بے شک بے حد اجاگر کیا ہے' لیکن عمل صالح کا سرچشمہ ایمان ہی کو قرار دیا ہے اور ایمان انسان کا اجتماعی مسئلہ نہیں ذاتی مسئلہ ہے۔ ہمارا عمل بے شک اجتماعی قالبوں میں ڈھل سکتا ہے لیکن ایمان ہم اپنے اندر اتر کر ہی لا سکتے ہیں' یہ نہ تو خوف سے پیدا ہوتا ہے' نہ جبر سے' نہ معاشرے کی ملامت سے' نہ تقلید سے۔ اس نظر سے دیکھیں تو فرد کی اہمیت اداروں سے اولین ہے۔ لیکن آج کل ایک انداز فکر یہ ابھر رہا ہے کہ اداروں کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے اور معاشرے کی اہمیت کو اتنا بڑھایا چڑھایا جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے شریک ٹھہرنے میں شاید ہی کوئی کسر رہ جاتی ہو۔

اس انداز فکر کا ایک مظہر یہ ہے کہ سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرتی قوانین میں جکڑنے کے لئے دھڑا دھڑ قانون سازی کی جائے' چنانچہ ملک میں سیاست کا بازار اس بہانے گرم کیا جاتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے

لئے چناؤ ہوگا۔ پھر ملک بھر کے بے خبر، بے درد، اور غیر ذمہ دار لوگوں کو قانون سازی کے اعزاز میں دھڑے بندیوں، مفاد پرستیوں اور دھاندلیوں کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ بحثیں ہوتی ہیں کہ اسلامی قانون بن سکتا ہے یا نہیں۔ مناظرے ہوتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ قانون سازی کا یہ تماشا ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کہ افراد کو اندر سے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ قانون کا احترام تو خدا کے خوف سے، اس کے قول فیصل پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ ایمان ہی موجود نہیں تو قوانین کی زنجیریں ریت کے رسوں سے بھی کمزور ثابت ہوں گی۔

Polanyi کا برسوں کا کام Personal Knowledge اس امر پر دال ہے کہ فرد ہی تمام تر معاشرتی ترقی کا سرچشمہ ہے اور علم کا حصول افراد ہی کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں قوانین صرف افراد سے متعلق ہیں لیکن اجتماعی مسائل کے لئے اصول دیئے گئے ہیں۔ فرد کے حقوق تو اتنے اہم سمجھے گئے کہ انہیں خدا نے خود متعین کر دیا لیکن معاشرتی معاملات کو اصول بتا کر ان کی تشکیل کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

میں یہ باتیں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کیونکہ آپ کے بارے میں عام احساس یہ ہے کہ آپ معاشرے کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔

میں اس مقام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اور کیا فرد کو بدلے بغیر معاشرے کو بدلنا ممکن ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا افراد کو نظرانداز کر کے اداروں کی تشکیل کا جتن گاڑی کو گھوڑے سے پہلے جوتنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا:

عبس و تولیٰ o ان جاء الا عمیٰ o وما یدریک لعله یزکیٰ o (۳-۱/۸۰)۔ کی آیات معمولی سے معمولی فرد کو بھی پوری اہمیت دینے کا واضح حکم نہیں؟

پرویز: جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ افراد نہ ہوں تو معاشرہ کہاں سے بنے گا؟ اس لئے بنیادی اہمیت افراد ہی کو حاصل ہے۔ صحیح ایمان سے افراد کے اندر جو تبدیلی واقع ہوگی اس کا مظاہرہ معاشرے میں ہوگا۔ افراد کی تعلیم و تربیت اس لئے نہایت ضروری ہے۔

لیکن ہمارے ہاں دین کا تصور ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور ہم نے اسے ''مذہب'' کے مرادف المعنی سمجھ کر اسے انفرادی مسئلہ بنا لیا ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق۔ میری بصیرت کے مطابق یہ تصور قرآنی نہیں۔ دین اجتماعی نوعیت کا نظام ہے اس لئے وہ امت کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں تاکہ دین کا صحیح تصور ان کے سامنے آ سکے۔ میری پیش کردہ فکر میں جو معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے تو اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے اس حقیقت

کو پیش کرنا ہے کہ اگر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر ہو تو اس سے محیر العقول انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں۔۔ اور یہ بات کسی دوسرے اجتماعی نظام سے ممکن نہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسلام اپنے لئے ایک الگ مملکت چاہتا ہے' اپنی آزاد حکومت چاہتا ہے۔ میں دین کے اسی تصور کو اجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں۔ ورنہ اگر دین خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق ہی کا نام ہو تو اس کے لئے نہ الگ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اپنی آزاد حکومت کی۔

جب دین کے تصورات اور ان کے انسانیت ساز جنت بداماں درخشندہ نتائج کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لیا جائے تو اس سے اس ایمان کی ندیاں رواں ہو جاتی ہیں جن کا سرچشمہ قلب انسانی کی گہرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔ لیکن صحیح تعلیم و تربیت تو آنے والی نسل کی ہو سکتی ہے (اس کے لئے میں اٹھارہ برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں)۔ جن افراد پر ہمارا موجودہ معاشرہ مشتمل ہے وہ موجودہ نہج پر پختہ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس معاشرے میں اسلامی اقدار کو کیسے رائج کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام قانون کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ اس کے لئے معاشرے میں قرآنی قوانین کا نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔

جو لوگ تعلیم و تربیت سے قطع نظر کر کے محض حکومت کے ڈنڈے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں وہ میرے نزدیک یہودی شریعت کے تصور کو تو کچھ سمجھتے ہیں لیکن نبی اکرم ﷺ کے معلم ہونے کی حیثیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔

اس مقام پر شاید کہہ دیا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے جماعت کی تشکیل کی تھی قانون کا اعلان ان پر بعد میں کیا گیا تھا لیکن تم موجودہ مسلمانوں پر قانون کا اطلاق ضروری سمجھتے ہو' اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا تھا اور انہیں مسلمان کرنے کا طریقہ تعلیم و تربیت تھا۔ اس لئے اس وقت جو معاشرہ متشکل ہوا تھا وہ تھا ہی ان مسلمانوں پر مشتمل جو تربیت یافتہ تھے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت اس کے برعکس ہے۔ یہاں پہلے سے ایک معاشرہ موجود ہے جو مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ مسلمان وہ ہیں جو تعلیم و تربیت کے بعد مسلمان نہیں ہوئے' وہ بس مسلمان ہیں۔ ان کی آئندہ نسل کو تو اسی طرح ''مسلمان کرنا'' چاہئے جس طرح نبی اکرم ﷺ نے دوسروں کو مسلمان کیا تھا۔ یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے۔۔۔ لیکن موجودہ مسلمانوں کو علیٰ حالہ نہیں چھوڑا جا سکتا' انہیں لامحالہ کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔ تو وہ قانون اور ضابطہ اسلامی کیوں نہ ہو؟ اس سے بھی بڑی حد تک معاشرتی اصلاح ہو جائے گی۔

میں اسے پھر واضح کر دوں کہ افراد اور معاشرے کا تعلق ایک مشین کے پرزوں اور خود مشین کا تعلق ہے جب تک پرزے صحیح حالت میں نہ ہوں گے مشین صحیح کام نہیں کرے گی۔ لیکن پرزے بھی تو اسی وقت اپنا مقصد پورا کریں گے جب وہ مشین کے اندر فٹ ہوں گے۔ ایک پرزہ اپنی ذات میں کتنا ہی

اصلح اور گراں بہا کیوں نہ ہو اگر وہ مشین سے باہر رکھا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا عدم وجود برابر ہے، اور مشین کے اندر ایک معمولی سا پیچ بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

دین کا نظام وہ مشینری ہے جس کے اندر ہر پرزہ (افراد معاشرہ) اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا فریضہ ادا کرتا اور یوں اپنی ہستی کا مقصد بروئے کار لاتا ہے۔ اس مثال میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مشین کے پرزے بے جان ٹکڑے ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر مصروف نقل وحرکت رہتے ہیں۔ اس کے برعکس افراد معاشرہ ذی حیات اور قابل نشو ونما نفوس ہوتے ہیں۔ اس نظام کے اندر ان کی نقل وحرکت بالارادہ ہوتی ہے جس سے خود ان کی صلاحیتوں میں بھی نشو ونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی جہاں اسلامی نظام کا مجموعی نتیجہ عالمگیر انسانیت کے لئے سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا ضامن ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس سے خود افراد معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی جلا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس نظام اجتماعی کے اندر ان افراد کی انفرادیت گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں یہ نظام خود ان افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بن جاتا ہے۔ یہ چیز دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں۔ دنیا میں جہاں فرد ہوتا ہے وہاں نظام کا تصور نہیں ہوتا۔ (مذاہب عالم میں یہی کیفیت ہوتی ہے) اور جہاں نظام ہوتا ہے وہاں فرد باقی نہیں رہتا (جیسے مغرب کے جماعتی نظاموں میں ہو رہا ہے)۔ یہ خصوصیت اسلامی نظام ہی کی ہے کہ اس میں نظام خود افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے۔ فرد اور معاشرے کا یہی وہ تعلق ہے جسے اقبال نے اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آراء و نگہدار خود است
ایکہ در قافلہ ای باہمہ روبے ہمہ شو

حنیف: خداوند کریم نے قرآن میں انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کی آیات کو آفاق وانفس میں تلاش کرے۔ جہاں تک آفاق کا تعلق ہے علوم وفنون کی راہ سے، سمع وبصارت اور ذہن کی راہ سے انسان اس قائم بالحق کائنات میں اللہ کے واضح اور نت کھلتے چلے جانے والے نشانات دیکھتا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ جہاں تک انفس کا تعلق ہے علمی سطح پر نفسیات نے عموماً اور تحلیل نفسی نے خصوصاً کچھ راہیں تراشی ہیں۔ پھر فلسفیوں نے انسانی ذات پر جو کام کیا ہے اس نے کچھ دریچے کھولے ہیں۔ سری آروبندو نے ''حیات ربانی'' میں اور اوسپنسکی نے ''اعجاز کی تلاش'' میں انسان کے اندر بسنے والے جہانوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارے یہاں اقبالؒ نے مکانِ دروں کے نظریئے سے اس اقلیم کی جانب توجہ دلائی ہے جو عموماً سربستہ رہتی ہے۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تصوف کی صحیح تعلیم یہی نہیں تھی کہ خدا کی آیات کو انفس میں تلاش کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے اور کیا جب تک آفاق کے ساتھ ساتھ

انفس میں خدا کی آیات کا وجود نہ نظر آئے یہ ممکن ہے کہ انسانی عمل کو وہ سر چشمہ نصیب ہو جائے جو دل میں خدا پر ایمان لانے ہی سے پھوٹتا ہے؟

آج ہم اضطراب' نامرادی اور سنگدلی کے جو مظاہر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کیا ان کی بناء یہ نہیں کہ ہم نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کو اس کا جائز حق نہیں دیا خصوصاً جبکہ خدا کا حکم موجود ہے کہ گناہ کے ظاہر سے بھی بچو اور اس کے باطن سے بھی بچو؟ بے شک اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا اور تصوف کی مروجہ شکلیں رہبانیت بلکہ ویدانت کی گھسی پٹی صورتوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کیا تصوف کا جوہر۔۔ یعنی انفس میں خدا کی آیات کی تلاش۔۔ ہمارے لئے ان راہوں کو روشن نہیں کر سکتا جو انسان کو لپک کر خدا کا رفیق بن جانے کی رغبت دلاتی ہیں؟

پرویز: تصوف ایک اصطلاح ہے اور جب تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے اس کی تائید و تردید میں بات کرنا مفید نہیں ہو گا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ تصوف یا صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں' حتیٰ کہ اس زمانے کے دوسرے لٹریچر میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھئے کہ تصوف ہے کیا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی علم کے ذرائع تجربہ' مشاہدہ اور تفکر ہیں۔ ان سے بلند ایک اور ذریعۂ علم ہے اور وہ ہے وحی۔۔۔ جو انبیاء کو ملتی ہے۔۔۔ وحی میں نبی کے ذاتی فکر یا تجربے یا مشاہدے' کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نبی حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا' حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس میں معروضیت (Objectivity) بنیادی چیز ہے۔ وحی کا سلسلہ نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا علم کا یہ ذریعہ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب ہمارے لئے علم کے دو ہی چشمے ہیں۔ ایک قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق اور دوسرا ان کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر۔ اگر کوئی شخص آج حقیقت کا علم خدا سے براہ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دراصل نبوت کا مدعی ہے۔

تصوف کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ صوفی حقیقت کا براہ راست علم خدا سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرخیل صوفیاء شیخ محی الدین ابن عربی کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا علم اس مقام سے حاصل کرتے ہیں جہاں سے نبی کو علم ملتا تھا۔ یہ تصوف کی وہ بنیاد ہے جو ختم نبوت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کا پتا نشان قرن اولیٰ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ تصور جو ایک بہت بڑی سازش کا پیش خیمہ تھا مسلمانوں میں بہت بعد میں لایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے''۔

اب آیئے انفس و آفاق والی آیت کی طرف۔ اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ قرآن جس انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے اسلام کی اولیں مخاطب قوم اس کو خود اپنے اندر بھی دیکھے گی اور دیگر اقوام عالم کے اندر بھی۔ لیکن انسان کی مضمر قوتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان پر غور و فکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے کئی مقامات پر تاکید کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ داخلی

مضمر قوتیں کیا ہیں۔ اس کے متعلق کسی مضمر پیچیدگی میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی اور جماعتی طور پر ہم ہر روز ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کے لئے علم کی قوت' بے پناہ ہمتوں اور قربانیوں کے لئے یقین محکم (ایمان) کی قوت' نظم وضبط کے تابع کام کرنے والے افراد کی مجموعی قوت' زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے صحیح عمل کی قوت' وغیرہ وغیرہ۔ یہ قوتیں قوانین خداوندی پر عمل کرنے سے ابھرتی ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اور جن کا محسوس مظاہرہ سب سے پہلے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے اسوۂ حسنہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا نام کردار کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ لیکن انسان کی بعض داخلی قوتوں کا ایک فنی پہلو بھی ہے۔ جس طرح ایک پہلوان خاص قسم کی کسرت اور ریاضت سے اپنی جسمانی قوت اتنی بڑھا لیتا ہے کہ وہ عام انسان ہی دکھائی نہیں دیتا اسی طرح خاص مشقوں کے ذریعے سے انسانی قوت ارادی کو اس طرح بڑھایا جاسکتا ہے کہ اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ ہندوؤں کی سادھیوں' مغ بچوں کے آتشکدوں اور عیسائیوں کی خانقاہوں (وغیرہ) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کی ایک منجھی ہوئی شکل آج ہمیں ہپناٹزم کی صورت میں ملتی ہے۔ انسان کی یہ قوت خالص فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بلا تفریق مذہب وملت ہر اس شخص کو حاصل ہوسکتی ہے جو اس قسم کی ریاضتیں اور مشقیں کرے۔ مگر توہم پرستی کی تاریکیوں میں اس کو ''روحانیت کی کرامات'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی کو تصوف کا کمال قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ ایک فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ دین قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے جس سے ایک فرد کے اندر حسین وجمیل کردار کی روشنی چمکتی ہے اور ان افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ مرتب ہوتا ہے وہ کاروانِ انسانیت کو اس منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے جو شرف وتکریم انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔

قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کو سیرت وکردار کے بلندترین مقام پر فائز بتایا ہے (انک لعلیٰ خلق عظیم اس پر شاہد ہے) صحابۂ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کے بھی حسنِ سیرت وبلندیٔ کردار ہی کا تذکرہ کیا ہے' ان کی کسی روحانی قوت کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جہاں قوموں کے عروج وزوال کے سلسلے میں یہ ابدی قانون بیان کیا ہے کہ

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ اپنے انفس میں تبدیلی نہیں کرتی۔ تو اس سے قوموں کی نفسیاتی تبدیلی مراد ہے۔ تصوف کی رو سے کوئی روحانی تبدیلی مقصود نہیں۔

تصوف تو قوم یا اجتماعی زندگی سے بحث ہی نہیں کرتا۔ قرآن کے لغت میں تصوف کے لئے رہبانیت کا لفظ آیا ہے جسے وہ ذہن انسانی کا خود تراشیدہ مسلک قرار دیتا ہے۔ تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصور پیش کرے۔

حنیف: ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیاء کرام کی مرہون منت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر بہت گہرا ہے' بلکہ اہل تصوف نے آگے

بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالیؒ شیخ احمدؒ سرہندی، شاہ ولی اللہؒ اور بعض کے نزدیک اقبالؒ کا بلند پایہ مجتہدین ہوتے ہوئے بھی تصوف سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا مقام اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت اور تصوف باہم شیر و شکر ہو جائیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے درحقیقت کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لئے اس قدر کاہش و کاوش کرنی پڑ رہی ہے لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔

باقی رہی شخصیتیں۔ تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ:

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔ ولا تسئلون عما کانوا یعملون۔

''یہ لوگ اپنے وقت میں گزر گئے، جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔''

لٰہذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ متقدمین ہوں یا متاخرین، ان میں سے کسی کے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے انہیں ہم قابل ستائش سمجھیں گے۔ جو اس کے خلاف جائیں گے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لئے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل۔

حدیث کے پرکھنے کا معیار

(1) سنیوں کے نزدیک

مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

تکثر لکم الا حادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ۔ فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ۔

میرے بعد تم سے بڑی کثرت سے حدیثیں بیان کی جائیں گی۔ لہٰذا میری کوئی حدیث تم سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ (قرآن) کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کرو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔

(2) شیعوں کے نزدیک

روی عنھم علیھم اسلام ما اتکم منا فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ۔ فما وافق کتاب اللہ فخذوہ وما خالفہ فاطرحوہ۔

(استبصار۔ جلد 3۔ صفحہ 158۔ بحوالہ ثقافت)

ائمہ سے مروی ہے کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس جو کچھ بھی آئے اسے کتاب اللہ (قرآن) کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو کچھ کتاب اللہ کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے پھینک دو۔

طلوع اسلام

احادیث کے پرکھنے کے لئے طلوع اسلام کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاوید چودھری

اگر یہ گورے کا مسئلہ ہوتا

لاہور میں میرے ایک دوست کالم نگار ہیں وہ مجھ سے سینئر ہیں اگر میں یہ کہوں میں نے ان کی تحریریں پڑھ کر قلم پکڑنا اور پھر گھسیٹنا شروع کیا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ کالم بے شمار لوگ لکھتے ہیں لیکن جتنا ابلتا' کھولتا اور تیزابی قسم کا کالم میرے یہ دوست تحریر کرتے ہیں اتنا آج تک کسی نے تحریر کیا اور نہ ہی کوئی کرے گا۔ میرے یہ دوست اپنی ذات اور اپنی تحریر دونوں میں انقلابی ہیں۔ وہ آج کل پاکستان میں مغرب کی انسان دوستی کے وکیل ہیں۔ وہ دوستوں کی محفل میں یورپ اور امریکہ کی ایجادات' انسانی حقوق اور ترقی کی اس قدر وکالت کرتے ہیں کہ لوگ انہیں جاسوس سمجھنے لگے ہیں۔ ہم لوگ ان سے اکثر کہتے ہیں ''یہ ٹھیک ہے ہم بہت پسماندہ ہیں' عالم اسلام نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی اسے کرنی چاہیے تھی' ہمارے زیادہ تر مسائل اور بگاڑ بھی خود پیدا کردہ ہیں لیکن اس کے باوجود عالم اسلام کو سرے سے مسترد کر دینا یا اسے فریادی ریوڑ کا خطاب دے دینا زیادتی ہے' اس کے جواب میں وہ بڑی دلچسپ دلیل دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں ''تم لوگ اس کمرے کا جائزہ لو اور بتاؤ اس میں کون سی چیز ہماری ایجاد ہے' تم لوگ پنکھے سے لے کر ہیٹر تک اور چھت سے لے کر دروازے کی ناپ تک کوئی چیز اپنی بتا دو' میں تمہارے ہاتھ چوم لوں گا' تمہاری قمیض کا بٹن تک کسی مسٹر فلپ کی ایجاد ہے' یہ کاغذ' یہ پین اور اس پین کی سیاہی تک کسی رچرڈ نے بنائی تھی' یورپ اور امریکہ میں گرمی نہیں پڑتی لیکن ان لوگوں نے ہم جیسے گرم علاقوں کے رہنے والوں کے لئے ایئر کنڈیشنر اور روم کولر ایجاد کئے۔ انہوں نے ہمیں ریفریجریٹر کا تحفہ دیا' تم یقین کرو یورپ اور امریکہ انسانیت کے محسن ہیں'' ہم لوگ عموماً ان کی باتوں پر ہنستے ہیں' ایک دن وہ میرے ساتھ لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل سے نکل رہے تھے' راستے میں ہمارا ٹاکرا ایک ایسے صاحب سے ہو گیا جو پان چبا رہے تھے' ان کا منہ پیک سے بھرا ہوا تھا' باچھوں سے سرخ رنگ کی ریلیں نکل رہی تھیں اور وہ بڑی سرگرمی سے کوئی ایسی جگہ

تلاش کر رہے تھے جہاں وہ اس پیک کا بوجھ ہلکا کرسکیں۔ آگے پیچھے کوئی ایسی جگہ نہیں تھی وہ صاحب جب سانس لینے تک سے لاچار ہوگئے تو ایک گملے پر جھکے اور اپنا سارا بوجھ پودے کی جڑوں میں اتار دیا۔ میرے دوست یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے' انہوں نے قہقہہ لگایا اور میرا بازو تھپتھپا کر بولے ''افسوس گورا پان نہیں کھاتا' اگر وہ پان کھاتا ہوتا تو وہ اب تک پیک لیس پان ایجاد کر چکا ہوتا' لوگ پان چباتے اور اس کی پیک دھواں بن کر کان یا ناک سے باہر نکل جاتی۔ لوگوں کو یوں گملے گندے نہ کرنا پڑتے'' میں نے قہقہہ لگایا اور ہوٹل سے باہر آ گئے۔

مجھے عید کے دن اپنا یہ دوست اور اس کی یہ بات بہت یاد آئی۔ میرے والد اور والدہ اس وقت حجاز مقدس میں ہیں۔ وہ حج کے لئے گئے ہیں۔ عید سے ایک دن پہلے میں نے ابا جی کو فون کیا' ان کی آواز میں ارتعاش سا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ ہنس کر ٹال گئے لیکن مجھے محسوس ہوا کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ میرے اصرار پر انہوں نے بتایا وہ منیٰ میں ہیں اور امی جی ہجوم میں گم ہوگئی ہیں۔ ابا جی خاموش ہوئے تو ٹینشن کا نہ ختم ہونے والا دور شروع ہوگیا۔ میں نے مذہبی امور کے وفاقی وزیر اعجاز الحق کو فون کیا وہ بھی سعودی عرب میں تھے۔ انہوں نے بتایا وہ خود گم ہو گئے ہیں اور پچھلے سولہ گھنٹوں سے انہیں راستہ نہیں مل رہا۔ میں نے وفاقی سیکرٹری وکیل احمد خان صاحب سے رابطہ کیا' وہ لاہور تھے' انہوں نے بھرپور مدد کا وعدہ کیا میں نے جدہ اور مکہ میں موجود اپنے تمام دوستوں سے درخواست کی لیکن سب کا کہنا تھا تیں پینتیس لاکھ لوگوں میں سے ایک خاتون کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔ اس کے بعد میرا پورا خاندان تھا' پریشانی تھی اور ٹیلی فون تھے۔ وکیل صاحب نے اپنے سٹاف کو کہہ دیا وہ بے چارے بھی کوششوں میں مگن ہو گئے لیکن پریشانی کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ عید کا سارا دن اسی پریشانی میں گزرا۔ عید کے دوسرے دن بھی تلاش جاری رہی۔ شام کو وکیل احمد خان صاحب نے خوش خبری سنائی ''اماں جی مل گئی ہیں' وہ چلتے چلتے مکہ پہنچ گئی ہیں'' ہم سب لوگوں کے دم میں دم آیا' ابا جی سے بات ہوئی تو معلوم ہوا وہ دونوں دوبارہ منیٰ جا رہے ہیں۔ امی جی نے ابھی رمی کرنی تھی ہم لوگ مطمئن ہو گئے لیکن ہم ابھی پوری طرح صدمے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ پتہ چلا منیٰ میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ ہم لوگوں نے دوبارہ ٹیلی فون سنبھال لیا ابا جی کا موبائل بند تھا۔ ٹینشن کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ سارا خاندان ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کے درمیان لٹک کر رہ گیا۔ ٹیلی ویژن پر مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر اعلان ہمارے سروں پر بم کی

طرح پھٹتا تھا۔ رات دس بجے والد صاحب سے رابطہ ہوا' معلوم ہوا وہ پوری طرح خیریت سے ہیں۔ ان کے موبائل کی بیٹری ختم ہوگی تھی ہم سب لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ آج ہفتے کا دن ہے میرے والدین مکہ میں بیٹھ کر فلائٹ کا انتظار کر رہے ہیں اور میں ان کی صحت مندانہ اور باعزت واپسی کے لئے لوگوں کی منتیں کر رہا ہوں۔

میں نے حج کے دوران بھگدڑ مچنے اور اس کے نتیجے میں حجاج کرام کی اموات کی پہلی خبر 1980ء میں پڑھی تھی۔ میں اس وقت چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد کوئی سال ایسا نہ گزرا جس میں حاجیوں کی اموات کی خبر نہ آئی ہو۔ ہر سال حج کی فلائیٹس واپس آتی ہیں تو وہ اپنے ساتھ آہیں اور سسکیاں لے کر آتی ہیں۔ پاکستان میں ہر سال سینکڑوں ہزاروں خاندان میری طرح سولی پر لٹک کر عید گزارتے ہیں۔ ہر سال بھگدڑ مچتی ہے۔ ہر سال خیموں میں آگ لگتی ہے' ہر سال کوئی نہ کوئی عمارت گرتی ہے۔ ہر سال لوگ گم ہوتے ہیں اور ہر سال فلائٹس لیٹ ہوتی ہیں اور ہم لوگ چند ماہ بعد یہ مسئلہ بھول جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف پاکستان تک محدود نہیں پورا عالم اسلام ہر سال ایسی صورتحال کا شکار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں سعودی حکومت حجاج کرام کے لئے سسٹم بنا رہی ہے۔ وہ سہولیات میں بھی اضافہ کر رہی ہے لیکن اس کے باوجود یہ مسائل موجود ہیں۔ اس کے باوجود حج کے دوران وہ نظم و نسق نظر نہیں آتا جو حج جیسے مقدس فریضے اور حجاز جیسی مقدس جگہ پر ہونا چاہئے۔ خدا کی پناہ اللہ کے گھر میں اللہ کے مہمان دوسرے مہمانوں کے قدموں تلے روندے جائیں۔ اس سے بڑی بدنظمی اور اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوگی۔ مجھے یقین ہے یہ خبر جب عیسائی و یہودی میڈیا سے نشر ہوتی ہوگی تو پوری دنیا ہم پر ہنستی ہوگی۔ وہ لوگ کہتے ہوں گے جو لوگ اطمینان سے شیطان کو کنکریاں نہیں مار سکتے وہ شیطان کا مقابلہ کیا کریں گے۔ میں کل سے سوچ رہا ہوں اگر یہ یورپ' امریکہ یا مشرق بعید کا مسئلہ ہوتا تو کیا یہ اب تک موجود رہتا؟ کیا اب تک لوگ اس طرح دوسروں کے قدموں میں روندے جاتے اور کیا اب تک وہاں اسی طرح بھگدڑ مچی رہتی؟ مجھے ہر بار اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ مجھے یقین ہے گورے اب تک اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر چکے ہوتے۔ وہ منیٰ میں ایسے بیس بیس پچیس پچیس منزلہ پل بنا چکے ہوتے' جن میں لوہے کی رکاوٹیں ہوتیں اور جن میں لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر کنکریاں مار سکتے۔ وہ ایسا سسٹم بنا چکے ہوتے جس میں لوگ ایک دوسرے سے الجھے بغیر طواف کر لیتے اور جس کے ذریعے لوگ تین دن میں اپنے اپنے گھروں میں واپس لوٹ

جاتے۔ میں جوں جوں اس نقطے پر سوچتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے میرا کالم نگار دوست ٹھیک کہتا ہے ''جو لوگ اللہ کے گھر میں نظم وضبط نہیں رکھ سکتے جو اپنے سے کمزور بیمار اور بوڑھے حاجی کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں وہ لوگ مومن تو دور انسان تک کہلانے کے قابل نہیں'' میرا دوست صحیح کہتا ہے ''اگر پان گورے کا مسئلہ ہوتا تو وہ اب تک پیک لیس پان ایجاد کر چکا ہوتا۔ وہ دس میل دور کھڑا ہو کر مشین کے ذریعے شیطان کو کنکریاں مار رہا ہوتا۔ وہ سیف اینڈ ساؤنڈ طواف کر رہا ہوتا۔ وہ حج کر کے باحفاظت واپس آ جاتا۔ وہ اصلی اور سچا مسلمان ہوتا''۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور بابت 17-01-2006)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل

ناموس رسول ﷺ پر گستاخانہ حملہ

عالم اسلام کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ جو کارٹون ستمبر ۲۰۰۵ء میں چھپے تھے ان کے بارے میں انہیں یورپ کے دیگر اخبارات کے دوبارہ چھاپنے پر فروری ۲۰۰۶ء میں معلوم ہوا۔ اس حرکت سے بلا شبہ ہر مسلمان کو بے حد دکھ پہنچا ہے۔ اس پر مختلف قسم کے ردعمل سامنے آئے ہیں اور کچھ سیاستدانوں اور نیم مذہبی رہنماؤں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا رخ پرتشدد مظاہروں کی طرف بھی موڑ دیا ہے جس میں اپنے ملک اور اپنے ہی بھائیوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ جن ملکوں کے اخبارات نے یہ کارٹون چھاپے ہیں وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی متعدد ویب سائٹس پر اسلام، نبی کریم ﷺ اور حتی کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جنہیں پڑھ کر جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شخص کا منہ نوچ لیا جائے لیکن کس کس کو اس طرح روکا جا سکتا ہے۔ اور جذبات میں آ کر اپنے ہی ملک کی املاک کو نقصان پہنچانا بھی تو عقل مندی نہیں ہے۔

انسانوں کی اکثریت ہر معاملے میں جذباتی ردعمل ظاہر کرتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی کے لئے قرآن کریم میں ایسے اصول دے دیئے ہیں جو کسی بھی مسئلے کا بہترین حل ہوتے ہیں چاہے کوئی انہیں پسند کرے یا نہ کرے۔ زیر بحث مسئلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مثال دی ہے کہ اس سے برتر کوئی انسان نہیں ہو سکتا چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔

ارشاد باری ہے:

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم کذٰلک زینا لکل امة عملھم ثم الیٰ ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون (الانعام۔۱۰۹)۔

''ان کے معبودوں کو جنہیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں گالیاں نہ دینا۔ یہ نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگ جائیں۔ ہر کوئی اپنے عمل کو صحیح سمجھتا ہے۔ انہوں نے اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے اور وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

افسوس ہے کہ ہمارے نام نہاد مذہبی رہنما اسلام

کو بطور مکمل نظام متشکل ہونے نہیں دیتے اور اس کی راہ میں روکاٹ بنتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفادات پورے نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اسلام کی جو شکل یہ پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیمات سے ٹکراتی ہے، جس کا نتیجہ اچھا نکل ہی نہیں سکتا۔ جب تک اسلام ایک نظام کے طور پر قائم نہیں ہوتا یہ لوگ بزعمِ خود اس خلا کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ یہ لوگ اسلام کے نام پر پیش کرتے یا جس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، دنیا اسی کو اسلام سمجھتی ہے۔ انٹرنیٹ پر جب ان لوگوں کو جو اسلام کے خلاف باتیں کرتے ہیں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام وہی ہے جو قرآن کریم میں ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کو اسلام سمجھیں گے جو تمہارے مذہبی لیڈر پیش کرتے ہیں۔

آپ گزشتہ چند ماہ کے اخبارات اٹھا کر ہمارے مذہبی لیڈروں کے بیانات پڑھیں، ان میں سوائے دھمکیوں کے اور کچھ نہیں ملتا۔ کبھی پاکستان کی حکومت کو دھمکیاں کبھی امریکا کو اور کبھی یورپ کو۔ ان دھمکیوں کی موجودگی میں دنیا کو کیسے باور کرایا جا سکتا ہے کہ اسلام امن کا پرچار کرتا ہے؟ اگر حقیقی معنوں میں کسی اسلامی مملکت کا وجود ہوتا تو وہ قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق امت واحدہ کی ترجمان ہوتی اور اتنی مضبوط ہوتی کہ وہ ساری دنیا میں امن قائم کرنے کی ضامن ہوتی۔ متعدد ملکوں میں بٹے ہوئے اور سینکڑوں فرقوں میں منقسم مسلمانوں کا دنیا میں جو مقام ہو سکتا ہے وہ سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ اگر تنازعات میں پڑے رہو گے تو ناکام ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (۸:۴۶) ایسے میں ان لوگوں کی دھمکیوں کا دنیا پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مروجہ اسلام کی بنیاد اللہ کی کتاب کی بجائے کتب روایات پر مبنی ہے۔ جب تک ہم قرآن کریم پر ان کتب کی بالادستی قائم رکھیں گے، دنیا کو کبھی قائل نہیں کر سکتے کہ اسلام امن کا ضامن ہے۔

لہٰذا اگر ہمارے مذہبی رہنما فی الواقع ناموس رسالت ﷺ پر حرف نہیں آنے دینا چاہتے تو انہیں اسی اسلام کا پرچار کرنا اور غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنا ہوگا جو قرآن کریم کے مطابق ہو اور اسی کے مطابق تمام مسلمانوں کو فرقوں سے نجات دلا کر امتِ واحدہ بنانے کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری مانچسٹر

ختم نبوت اور افتریٰ

سورۃ الانعام میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ یہ بڑی بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ یہ اس تعلیم کو سچ کر دکھانے والی ہے جو اس سے پہلے دی گئی تھی۔ (اے رسول ﷺ) تم اس کے ذریعے (پہلے) اس مرکزی مقام (مکہ) اور اس کے گردوپیش کے باشندوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو۔ اس پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے بعد کی زندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ ایک صحیح نظام آکر رہے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ خدا کے مقرر کردہ نظام الصلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں (۶/۹۳) آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں' جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان بالقرآن کی بنیاد خدا کے قانون مکافاتِ عمل پر ایمان ہے۔ قرآن میں اس قانون کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس لئے ایمان بالقرآن اور ایمان بالآخرت لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ آخرت پر۔ یعنی نظری طور سے ان الفاظ پر ایمان ہے' ان کے مقصود و مطلوب سے نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت تمام نوعِ انسان کے لئے تھی اس کا آغاز حضور ختمی مرتبتؐ نے اپنے اقربا سے کیا۔ اس کے بعد اس کا دائرہ مکہ اور اس کے گردونواح تک وسیع کر کے پوری کی پوری قوم کو مخاطب کیا گیا اور یہ سلسلہ قوم کے دائرہ سے بھی آگے چلا گیا۔ ختم نبوت کے بعد یہ سلسلہ امت محمدیہ ﷺ کی وساطت سے آگے بڑھنا تھا یہ سلسلہ ایک وقت تک جاری رہا اور اس کے بعد اس کے بعد ہم آ گئے جن کا خود اپنا ہی قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن کا پیغام نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے نہ کسی خاص خطہ ملک تک محصور۔ یہ تمام انسانی کے لئے ضابطہ زندگی ہے' اور قرآن کے دعویٰ کے مطابق اسے دنیا کے تمام ضوابط پر غالب آکر رہنا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ وحی صرف انبیاء کرام کو عطا ہوتی ہے۔ غیر از نبی اگر اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کاذب اور فریب کار ہے۔ اس آیت کے پہلے جز میں کہا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر سنگین مجرم کون ہو سکتا ہے' جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں منسوب کر دے خدا کی طرف یعنی اپنی طرف سے وضع کردہ عقائد و احکام کو شریعت خداوندی کہہ کر پیش کرے۔ لہٰذا اس رسول ﷺ کی موجودگی میں یا اس کے بعد یہ دعویٰ کہ مجھے خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے' کذب وافتریٰ ہے (القرآن ۶/۹۴)۔

(بشکریہ جنگ لندن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

دین کے اجزاء اسلامی مملکت کی بنیاد ہوتے ہیں

قرآن کریم کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے مسائل کا اور کوئی حل موجود نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ ایک ضروری بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ابتداء آفرینش سے آج تک انسانی عقل نے رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ ذہن انسانی ابدی حقائق کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لایا ہے اور ان سے بتدریج مانوس و واقف ہوا ہے۔ اگر وہ حقائق انقلابی طور پر بیک وقت نمودار ہو جائیں تو وہ انقلابی نظریات کہلاتے ہیں اور عام ذہن ان کا عادی نہیں ہوتا۔ وہ نظریات اپنے زمانہ کی سطح سے بہت بلند ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے تو وہ انقلابی ہوتے ہیں۔ اگر وہ نظریات اپنے زمانہ کی سطح کے مطابق ہوں تو پھر وہ انقلابی کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے انقلابی نظریات قبل از وقت ہوتے ہیں۔ اس زمانہ کا انسان ان کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہوتی ہے کہ ذہن انسانیت کو تعلیم و تربیت کے ذریعے بلند کیا جائے۔ جس درجہ ذہن انسانی بلند ہوتا جائے گا اسی نسبت سے وہ انقلابی نظریات کو اپناتا چلا جائے گا۔ قرآن کریم اپنے وقت سے بہت پہلے نازل ہوا ہے اور اس دور کی علمی سطح اس درجہ پست تھی کہ وہ اسے قبول ہی نہیں کر سکی۔ ہمارے ہاں حضورﷺ کی سیرت پر بہت کام ہوا ہے۔ آپﷺ کی سیرت کے تمام گوشے زیر نظر آئے۔ لیکن حضورﷺ کی سیرت کا یہ پہلو نہایت ہی قابل مدح و لائق صد توصیف ہے کہ یہ صرف حضورﷺ کی سیرت مبارکہ، آپ کی رات دن کی انتھک محنت و کوشش اور آپ کی انسانیت سے غم گساری ہی تھی کہ آپ نے اس قدر عظیم اور ہمہ گیر انقلاب اس دور میں برپا کر دیا کہ جس کے لئے اس دور کی انسانیت بالکل تیار و آمادہ ہی نہیں تھی۔ اس دور میں اس کے برپا ہونے سے کم سے کم اتنا تو ثبوت مل گیا کہ یہ انقلاب اور ضابطۂ حیات اس دور میں بھی قابل عمل تھا اور آج بھی قابل عمل ہے۔ یہ تو پھر اس دور کی بات ہے۔ آج جب کہ ذہن انسانیت بہت بلند ہو گیا ہے ہم مسلمان

آج بھی قرآن کریم کی خالص تعلیم کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں جو جماعتیں توہم پرستی پر مبنی عقائد کو رواج دے رہی ہیں وہ عوام میں مقبول ہوتی جا رہی ہیں اور جو خالص قرآنی نظریات کی داعی جماعتیں ہیں وہ کسی طرح بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ اس کی واضح مثال ہمارے ہاں تصوف اور تبلیغی جماعت کی ہے۔ جو ہمارے سامنے وجود میں آئی اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں کی تعداد میں پھیل گئی۔ اس کے برخلاف قرآنی نظریات کی حامل تحریکیں بہت ہی آہستہ آہستہ اثر و رسوخ حاصل کر رہی ہیں۔ آپ اس تجربہ کو بحیثیت ایک Barometer کے خیال فرمائیں کہ جو تحریک جس قدر قرآنی نظریات کے قریب ہوگی، وہ عوام میں اسی قدر مشکل سے پاؤں جما سکے گی۔

قرآن کریم نے اس دور میں ارشاد فرمایا کہ وما خلقنا السمٰوٰت والارض وفیھما باطلاً (۳۸/۲)۔ہم نے زمین وآسمان کو باطل پیدا نہیں کیا' یہ سلبی بیان تھا اسی کو اصرار کے ساتھ ایجابی طور پر بیان فرمایا کہ خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق و لتجزیٰ کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون (۴۵/۲۲)۔اور اللہ نے سارے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تا کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے۔ اور ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ اس آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ کائنات کا مقصد تخلیق یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے۔ اس دنیا میں صرف وہ معاشرہ قائم رہ سکتا ہے جو کائنات کی تخلیق کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوگا اور ہر وہ معاشرہ جو کائنات کی تخلیق کے مقاصد کے خلاف ہوگا' وہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثال اس کشتی کی ہوگی جو دریا کے دھارے کے خلاف چل رہی ہے۔ قرآن کریم نے معاشرہ کی تعمیر کے لئے جو اساسی اصول اور مستقل اقدار فراہم کی ہیں وہ کائنات کی تخلیق کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ہی ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس دنیا مین صرف وہ معاشرہ پائیدار ہوگا جس میں علاوہ دیگر مستقل اقدار کے یہ دو اقدار لازمی طور پر جاری ہوں کہ ہر شخص کو اس کا بدلہ مل جائے اور کسی فرد پر بھی کوئی ظلم نہ ہو۔ جو معاشرہ باطل کی بنیادوں پر استوار ہوگا وہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ زیادہ دیر صرف وہ معاشرہ چلے گا جو حق کی بنیاد یعنی مستقل اقدار پر قائم ہوگا۔ آپ ان بنیادوں کو ملاحظہ فرمائیں پھر آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ معاشرہ کی یہ بنیادیں کس درجہ قبل از وقت تھیں اور کیوں وہ معاشرہ قائم نہیں رہ سکا۔

(۱) نظام کائنات کی یکسانیت' اس کے قوانین کی

عالم گیریت اور توحید خداوندی کا لازمی نتیجہ وحدت مخلوق ہے۔ اس اعتبار سے ساری مخلوق ایک عالم گیر برادری ہے جس میں حدود و قیود کی تقسیم غیر فطری اور نقصان رساں ہے۔

(۲) چونکہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و رب ہے' اس لئے انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے اور حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۳) چونکہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور رزق کی ذمہ داری اس پر ہے (۶/۱۱) اس لئے رزق فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لیتا ہے۔

(۴) روحانی یا مقدس ہستی ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت شعبدہ یا کرامت ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ حضورﷺ کا یہ اعلان کہ وہ تمام انسانوں جیسے انسان تھے۔ خصوصی امتیاز صرف یہ تھا کہ انہیں وحی ملتی تھی اور جب وہ اپنی وحی دوسروں کو پہنچا دیتے تھے' پھر وہ بالکل عام بشر ہو جاتے تھے اور ان میں پھر وہی عام انسانوں جیسے احساسات ہوتے تھے' اور کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں ہوتی تھی' یہ نظریہ اپنے دور سے بہت قبل از وقت تھا اور حق پر مبنی معاشرہ کی ایک اہم شق۔

(۵) کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں (۵۶/۷۳)۔

(۶) ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)۔ بقا اسی کے لئے ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہ قرآن کریم کا ایک محکم اور بنیادی اصول ہے۔ کسی خاص جماعت' خاص پارٹی' خاص گروہ' خاص ملک' خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش' حتی کہ اس میں مسلم و غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

(۷) نوع انسانی کی ربوبیت سے ہر فرد کی اپنی تربیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم ایک ایسی مملکت قائم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمینی کی مظہر ہوتی ہے اور جس میں دوسروں کی ذات کی تکمیل کرنے سے اپنی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اصل مقصد انسانی ذات کا ارتقاء ہوتا ہے جو ربوبیت عامہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور مجموعی طور پر زندگی ترقی کرتی جاتی ہے۔

اسلامی مملکت کی یہ وہ اساسات تھیں جو وقت سے پیشتر و بلند ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل نہیں کر

سکیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد دین کے اجزاء پر ہوتی ہے۔ دین کے یہ اجزاء محکم' ابدی' سرمدی ہیں اوران کو آیہ کریمہ (۲/۱۷۷) میں مفصل بیان کردیا ہے یہ اللہ' رسل' ملائکہ' کتب اور آخرت پر ایمان ہے۔ ان پر ایمان ہی اس وجہ سے لاتے ہیں کہ جب ہم ان اجزاء ایمان کو روبہ عمل لاتے ہیں' تو ان پر ہی اسلامی ریاست کا قیام ہوتا ہے۔ان اجزاء میں سب سے پہلا جز ایمان باللہ اور خالص توحید ہے۔ خدا پر ایمان سے عملی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس عطا کردہ وحی پر ایمان لایا جائے اور وحیٔ الٰہی کے احکام وقوانین کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے۔ یاایھا الذین آمنوا کے عملی معنے یہ ہیں کہ اے وہ لوگوں جو اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ ہم اس بات پر ایمان لائے ہیں کہ اللہ کے عطا کردہ نظام سے بہتر کوئی اور نظام نہیں ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کو معبود مان لینا اور اس کو خارجی کائنات کا خالق' مالک وحاکم قرار دینا کافی نہیں ہے۔اس پر ایمان لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے عطا کردہ نظام کو عملاً اس دنیا میں رائج کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ایک ذات ہے اور انسان بھی ایک ذات ہے۔انسان کی ذات خدا کی عطا فرمودہ ہے' ذات خداوندی کا جز ونہیں ہے۔ کیونکہ ذات تقسیم نہیں ہوسکتی۔ خدا کی ذات چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ہوتی ہے اس لئے اس کی صفات بھی مکمل ترین اوراعلیٰ ترین ہیں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو اسماء الحسنٰی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ انسانی ذات اللہ کی ذات کے مقابلہ میں فروتر اور محدود ہے لیکن اس میں تمام صفات خداوندی موجود ہوتی ہیں سوائے ان صفات کے جو خدا کی لا محدودیت اور ابدیت سے متعلق ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو اپنے اندر اجاگر کرے کہ یہی زندگی کا مقصود ہے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے قوانین کو صفات الٰہی کی اساس پر قائم کرے۔ اسلامی حکومت' صفات الٰہی' یا دوسرے الفاظ میں مستقل اقدار کو نافذ کرتی ہے۔ چونکہ انسان ان قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے جو صفات الٰہی پر قائم ہوتی ہیں اس لئے ان کی اطاعت سے انسان کی ذات ازخود نشو ونما حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ غیر اسلامی حکومت میں یہ بات نہیں ہوسکتی۔ عملی طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رب العالمینی ہے۔ اسلامی حکومت کے قوانین اس صفت سے متصف ہوں گے۔ زکوٰۃ' صدقات' عشر' خیرات' ایثار' احسان وغیرہ چونکہ اس مملکت کے قوانین ربوبیت پر قائم ہوں گے' اس لئے اس مملکت کے شہری اس صفت کو بروئے کار لا رہے ہوں گے۔ اس لئے ان میں یہ صفت خود مشہود ہوتی جا رہی ہوگی' اس کے برخلاف

غیر اسلامی حکومت جس میں سب قوانین ربٰو پر منحصر ہوں گے وہاں کے عوام ربٰو پر موقوف قوانین کی پیروی کریں گے تو ان میں صفت ربوبیت پرورش نہیں پائے گی۔ اسلامی حکومت میں صفات خداوندی شہریوں میں ازخود اجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا قیام ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ طاغوتی حکومت میں ذات انسانی روز بروز اضمحلال پذیر ہوتی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اس لئے بھی قدم قدم پر اطاعت خداوندی ہوتی چلی جاتی ہے۔ آپ گھر سے برآمد ہوئے' آپ نے اپنی کار کو ٹریفک سگنل پر روکا' اسلامی حکومت میں آپ کا ٹریفک سگنل پر رکنا' ''اللہ و رسول'' کی اطاعت ہوگا۔ اسی مثال کے ذریعے آپ سمجھ لیں کہ اسلامی حکومت میں قدم قدم پر آپ اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں جبکہ طاغوتی نظام میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے اور آپ رات دن معصیت و عصیان الٰہی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ ان دو مثالوں سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ایمان باللہ یا توحید الٰہی کس طرح اسلامی حکومت کی اساس قرار پاتے ہیں۔

جب بھی چند افراد زندگی کا ایک نصب العین مقرر کر لیتے ہیں تو ان میں نصب العین کے اشتراک کی وجہ سے آپس میں باہم محبت' مودت و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نام وحدت فکر و خیال ہے۔ اب اسی اصول کو آپ وسیع کرتے چلے جائیں۔ جب دنیا کے تمام افراد انسانیہ ایک ہی نصب العین مقرر کر کے' اس کے حصول کی کوشش کریں گے' تو توحید کا لازمی نتیجہ وحدت انسانیت ہوگا۔ اس کے علاوہ وحدت انسانیت کے حصول کا دوسرا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دین کے اجزاء میں سے اس پہلے جز پر ایمان لانے سے ساری دنیا کے انسان ایک امتہ واحدہ بن جاتے ہیں۔ خطہ زمین پر خود ہی لکیریں کھینچ کر آپس میں افتراق انشقاق پیدا کرنا اور ایک دوسرے کا دشمن بن کے ایک دوسرے کو ہلاک کرنا' اس جز پر ایمان لانے سے ختم ہو جاتا ہے۔

توحید پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت خاص اللہ تعالیٰ کے لئے' مختص ہو جاتی ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی حکومت جائز نہیں رہتی۔ توحید کا نظریہ اسلامی حکومت میں کس طرح روبہ عمل ہوتا ہے' یہ اہم نکتہ مضمون کے آخر میں آتا ہے۔

دین کا دوسرا جز جس پر ہم ایمان لاتے ہیں رسالت یا نبوت ہوتا ہے۔ نبوت کے معنے خدا کی طرف سے وحی کا علم حاصل ہونا ہے۔ نبی اس علم کو حاصل کر کے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے' اس کے اس منصب کو

رسالت کہا جاتا ہے۔ یعنی نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کی دو اطراف یا دو جہتیں ہیں۔ ہر رسول نبی ہوتا تھا اور ہر نبی رسول۔ قرآن کریم کی رو سے ہر نبی اور رسول کو کتاب ملی تھی۔ رسول کا فریضہ وحی خداوندی کو صرف دوسروں تک پہنچانا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اس وحی خداوندی کے مطابق معاشرہ کو عملاً متشکل کرتا تھا۔ اسے نظام خداوندی یا اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا عملی پہلو ہی تھا کہ حضورﷺ نے یہ نظام اپنی حیات مبارکہ کے دوران قائم فرمایا۔ حضورﷺ کے بعد یہی نظام خلافت راشدہ میں قائم رہا۔ اسے ہمیشہ قائم رہنا چاہئے تھا اور اب بھی ہم سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہم اس کو قائم کریں۔ دین کے اس جز کا عملی تقاضہ ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کریں۔ یہ دوسرا جز اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کریں اور اسی وجہ سے وہ اسلامی حکومت کی اساس بنتا ہے۔

ابتداء آفرینش سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی قوم کی طرف تشریف لاتے اور وحی کے مطابق معاشرہ قائم فرماتے۔ اگر ان کی قوم ان کو اس طرح کا معاشرہ قائم کرنے میں مزاحم ہوتی تو وہ اس مقام سے ہجرت کرتے اور ایسے مقام پر تشریف لے جاتے کہ جہاں وہ اس قسم کا معاشرہ قائم کر کے' اس میں اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری کر سکتے۔ رسالت پر ایمان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ ہم بھی رسول کی عطا کردہ وحی کے مطابق معاشرہ قائم کریں' اور اس طرح دین کا یہ دوسرا جز یعنی ایمان بالرسل' اسلامی حکومت کی اساس قرار پاتا ہے۔

زندگی جب انسانی پیکر میں آئی تو یہ حیوانی سطح کی تین جبلتیں' یعنی افزائش نسل اپنی حفاظت اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا' اپنے ساتھ لائی۔ حیوانی سطح تک تو ان جبلتوں پر فطرت کا کنٹرول تھا جو حیوانات میں ازخود موجود تھا۔ وہ اس کنٹرول کے باہر نکل ہی نہیں سکتا لیکن انسانی زندگی میں یہ کنٹرول نہیں رہا۔ اب انسان آزاد ہے جو جی میں آئے کرے۔ حیوان کے پاس تو دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ محض اس کی جسمانی طاقت تھی۔ لیکن انسان کے پاس تو مہلک ترین ہتھیار ہیں اور جس قدر انسان ترقی کرتا جا رہا ہے' اس کے ہتھیاروں کی ہلاکت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ جب اس قدر قوت مہیا ہو اور پابندیاں کوئی نہ ہوں تو دنیا کا کیا حال ہو گا۔ اس کے لئے کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں' ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اس کا گواہ ہے۔ ہلاکت و تباہی سے محفوظ رکھنے کی غرض

سے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ جاری فرمایا اور کتابوں پر ایمان لانا ہمارے دین کے اجزاء میں شامل فرمایا۔ اب انسان اس بات کا پابند ہے کہ وہ وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق اپنا معاشرہ قائم کرے اور اس کے عطا کردہ قوانین واحکامات کو اپنے معاشرہ میں جاری کرے کہ یہی دین ہے۔

قرآن کریم نے آیہ کریمہ ولا یدینون دین الحق (۹/۲۹) (ترجمہ) (اور نہ ہی سچے دین کو اختیار کرتے ہیں)۔ میں دین کے ساتھ حق کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور حق کے معنے کسی چیز کا اس طرح موجود و واقع ہونا اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے ہے۔ حق کے بنیادی معنی میں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت ثابتہ بن کر آنا' لازمی شرط ہے۔ قرآن کریم نے دین کے ساتھ حق کا لفظ استعمال فرما کر یہ بات واضح کر دی کہ دین کوئی تصوراتی' ذہنی یا ذاتی احساسات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جو خارج میں واقع ہوتی ہے اور عملی طور پر معاشرہ میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

آج دنیا جن مصائب و مشکلات سے دوچار ہے اس کا ایک بڑا سبب دین و دنیا کو مختلف دو دوائر میں تقسیم کرنا اور سیاست کو مستقل اقدار سے آزاد کرانا ہے۔ یہ دین و دنیا کی تقسیم مذہب میں تو چل سکتی ہے۔ دین میں یہ دخل نہیں پا سکتی۔ مذہب تو خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی' عمرانی' سیاسی' معاشی' معاشرتی' زندگی سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ہر مذہب کا پیرو (Follower) اپنے خیال کے مطابق' اپنے اپنے طور پر ہر جگہ قائم کر سکتا ہے اور بس یہاں یہی مذہب کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس دین کا تصور یہ ہے کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے۔ یہ زندگی کا ایک ضابطۂ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی سب پر محیط ہے اور اسی وجہ سے اس میں دین و دنیا (Church and State) کی تفریق نہیں ہو سکتی۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے۔ الذین ینقضون عھداللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما انزاللہ ان یوصل و یفسدون فی الارض اولٰئک ھم الخٰسرون (۲/۲۷)۔ جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو توڑ دیتے ہیں جنہیں خدا نے باہمی ملانے کا حکم دیا ہے ان کے ٹکڑے کر دیتے ہیں وہ اس طرح ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔ جو احکام الٰہی کی

اطاعت (محکومیت) کا عہد و میثاق کر کے پھر اسے توڑ دیتے ہیں' اس عہد سے پھر جاتے ہیں اور جن عناصر و اجزاء یعنی مذاہب وسیاست کو ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے' ان کو قطع کرنے میں بیباک ہیں اور اپنی سرکشیوں سے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں' یہ لوگ بہت ہی نقصان میں ہیں۔

عہد اللہ درحقیقت احکام خداوندی کی اطاعت کرنے کا دوسرا نام ہے ایک شخص جب خدا کی کتاب پر ایمان لاتا ہے تو وہ اس امر کا عہد کرتا ہے کہ وہ اس کے ہر اس حکم کی اطاعت کرے گا جو اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے لوگوں کے حقوق درہم برہم کرنا فساد ہے (۷/۸۵) صالح نظام کو درہم برہم کرنا فساد ہے (۲۷/۳۴) ارتکاب جرائم کرنا فساد ہے (۱۲/۷۳)۔ اس کی علاوہ بھی بہت سے امور فساد کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ فساد کی ان خصائص ونظائر کے پیش نظر آیت بالا کی رو سے دنیاوی اور دینی امور کو الگ الگ کردینا بھی فساد میں ہی شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو دنیاوی اور دینی دونوں امور کو کتاب الٰہی کے تابع کیا ہے۔ جو امر بھی کتاب الٰہی کی اتباع سے نکل گیا' وہ باعث فساد ہے۔ جب تمام امور کتاب الٰہی کے اتباع میں آگئے تو پھر دین ودنیا کی تفریق ازخود ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح کتاب پر ایمان اسلامی مملکت کی بنیاد بن جاتا ہے۔

دین کا چوتھا جز ملائکہ پر ایمان ہے۔ ملائکہ کا عقیدہ گذشتہ امتوں میں ہمیشہ سے چلا آرہا ہے لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں انسانی ذہن نے افراط وتفریط کی ہے' بعینہ یہی شکل ملائکہ کی رہی ہے۔ ان کے متعلق عجیب وغریب تصورات اختیار کئے گئے تھے۔ قرآن کریم نے ان خودساختہ عقائد کو الگ کر کے' ملائکہ کی حقیقت تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔ اس مضمون کا موضوع چونکہ ملائکہ نہیں ہے اس لئے اس مضمون میں صرف ملائکہ پر ایمان اور اس کا اسلامی حکومت کی بنیاد بننا' بیان کیا جائے گا۔ جن حضرات کو ملائکہ کے مضمون سے دلچسپی ہو وہ راقم سطور کا مضمون ''ملائکہ کی حقیقت'' ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے سابقہ تفسیر بالروایات کے لٹریچر میں بھی ملائکہ کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اسکا پیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اس سارے لٹریچر کا دارومدار روایات پر ہے اور ان روایات میں دو نمایاں سقم ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں دوسرے وہ روایات اپنے دور کی ذہنی سطح کے مطابق وضع کی گئی تھیں' اس لئے وہ تمام تر توہم پرستی علمی کم مائیگی پر مبنی ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ملائکہ کا ایک معیار بیان فرمایا گیا

ہے کہ ملائکہ دکھائی نہیں دے سکتے لم تروھا () لیکن ہماری تفاسیر میں ملائکہ کو مرئی قرار دیا گیا ہے۔خصوصاً کلبی کی روایت اس بارے میں بہت مشہور ہے۔

قرآن کریم کے مطابق ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو اس کارگہ کائنات کو مشیتِ خداوندی کے مطابق چلا رہی ہیں اور نظام کائنات کو اس طرح چلانے کا نام قرآن کریم نے ''تدبیر امور'' کی اصطلاح سے بیان فرمایا ہے چونکہ یہ تدبیر امور ملائکہ کر رہے ہیں اس لئے ملائکہ کو فالمدبرات امراً (۷۹/۵) بھی فرمایا گیا ہے۔ کائنات کی ان تمام قوتوں (Physical Forces) یعنی ملائکہ کو انسان اپنے تابع کر سکتا ہے اور یہی مفہوم آدم کے سجدہ کرنے سے ہے۔ جس قدر بھی سائنس نے آج تک ترقی کی' کائنات کی قوتیں یعنی ملائکہ مسخر ہوتے چلے گئے۔ ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا اور خارجی قوتوں کے مقام کا صحیح تعین کرے۔ گذشتہ زمانے میں انسان ہر مافوق الفطرت چیز سے ڈر کر اس کی پرستش کرنے لگ جاتا تھا۔ لیکن ملائکہ پر ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ ملائکہ انسان کے زیرنگیں ہیں اور ان کا یہی صحیح مقام ہے۔ مقام آدم یہ ہے کہ ان کو مسخر کرے۔ ان کی تسخیر سے انسانیت بے حد فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن تسخیر کائنات سے جو کچھ فوائد و منافع حاصل ہو رہے ہیں وہ غالب اقوام اپنے لئے مخصوص کر لیتی ہیں اور کمزور اقوام کو اس کے انتفاع سے محروم رکھتی ہیں۔ لیکن اسلامی مملکت کا یہ کام ہے کہ تسخیر کائنات کے ماحصل کو پوری نوع انسانی کے لئے کھلا رکھے اور اس کو مستقل اقدار کے مطابق پوری انسانیت کے درمیان تقسیم کرے تاکہ پوری انسانیت اس سے فائدہ اٹھاتی رہے اور اس طرح ملائکہ پر ایمان اسلامی حکومت کی ایک بنیاد بن جاتا ہے۔

صدرِ مضمون میں آیۂ کریمہ تحریر کی گئی تھی ولتجزی کل نفس بما کسبت (۴۵/۲۲)۔ تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ مل جائے۔ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں اعمال کا بدلہ فوری طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص زہر کھاتا ہے تو فوری اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو زہر کھانے کا بدلہ فوری مل گیا۔ لیکن یہ صورت اخلاقی ضابطہ یا مستقل اقدار کے سلسلہ میں پیدا نہیں ہوتی۔ جو شخص حرام مال کھاتا ہے اس کے اثرات نفس پر مرتب ہو جاتے ہیں۔ یہ اثرات ملائکہ مرتب کرتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں جان سکتے کہ ملائکہ ان اثرات کو انسانی دنیا میں کس طرح روبہ عمل لاتے ہیں اور ملائکہ اس بارے میں کیا Part Play کرتے ہیں اور انسانی ذات حرام

کھانے سے کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بات ابھی انسانی ذہن سے ماوراء ہے' اور انسانی حیطۂ ادراک سے باہر ہے' لیکن سائنس کی اور خصوصاً علم نفسیات (سائیکلوجی) کی ترقی کے بعد' یہ بات بھی' انسان کے علم میں آ جائے گی۔

چونکہ نفس انسانی پر جو بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ملائکہ کرتے ہیں' اس لئے اطاعت خداوندی اور معصیت خداوندی کی جو سزا و جزا ملتی ہے وہ ملائکہ کے ذریعے ہی ملتی ہے۔ ملائکہ پر ایمان لائے بغیر سزا و جزا کا تصور باطل ہو جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت سے جیسا کہ سابقہ میں تحریر کیا گیا ہے' ازخود متواتر و مسلسل جزا یا سزا کے اثرات نفس انسانی پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اسلامی حکومت کی اطاعت یا نافرمانی کرے گا تو اس کے اثرات ملائکہ مرتب کریں گے اور اس طرح ملائکہ پر ایمان لانا اسلامی حکومت کی اساس یا اس کی بنیاد بن جاتا ہے۔

جرم و سزا کا مسئلہ بھی بڑا غور طلب اور گہری فکر کا متقاضی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا اس مضمون سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے تاہم یہ مسئلہ اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ جب ایک آدمی چوری کرتا ہے تو اس کے دو اثرات واقع ہوتے ہیں۔ ایک تو اس نے معاشرہ کے خلاف جرم کیا اور دوسرے اپنی ذات کے خلاف جرم کیا اور اس کی ذات پر ملائکہ نے برے اثرات مرتب کئے۔ جس سے اس کی ذات میں اضمحلال پیدا ہوا۔ معاشرہ نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس کو ایک سال کے لئے قید کی سزا دے دی۔ وہ ایک سال قید میں گذار کر معاشرہ میں پھر زندگی گذارنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن اس چوری سے جو اثرات اس کے نفس پر مرتب ہوئے تھے وہ ایک سال کی قید کی سزا سے دور نہیں ہوئے۔ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں وہ اسی طرح جواب دہ ہے۔ لیکن اگر یہ چوری اس نے اسلامی حکومت میں کی اور اس کو اسلامی قانون کے مطابق سزا ملی۔ خواہ وہ قید ہو' یا جرمانہ۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے وہ سزا جاری ہو' تو اس کے مکمل ہونے کے بعد اس کی ذات کے برے اثرات بھی دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس نے اسلامی حکومت کی سزا کو برداشت کیا اور اسلامی حکومت کی اطاعت کی ہے۔

اجزاء ایمان کا آخری جز قیامت پر ایمان لانا ہے یعنی ایمان بالآخرۃ یہ اس مضمون کی آخری کڑی ہے اور جزئیات ایمان کے سلسلہ کی بھی آخری کڑی ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ایمان باللہ اور آخری کڑی ہے ایمان بالآخرت۔ ایمان باللہ کا عملی مفہوم تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مستقل'

ابدی' اقدار و قوانین کی صداقت پر محکم یقین اور ان کا اسلامی حکومت میں جاری کرنا ہے اور ایمان بالآخرۃ کا عملی مفہوم ہے اسلامی حکومت میں جاری کردہ اصول و قوانین و احکامات پر عمل کرنے کے حیات آور ثمرات اور ان کے خلاف عمل کرنے کے نقصان دہ نتائج پر ایمان رکھنا۔ قرآن کریم نے جو احکامات دیئے یا جو عبادات مقرر فرمائی ہیں ان کے نتائج صرف اس نظام میں ہی برآمد ہوتے ہیں بغیر نظام قائم کئے ان عبادات کے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ صلوٰۃ' زکوٰۃ' حج وغیرہ جیسی عبادات ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن یہ کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ دوسرا موضوع ہے۔ یہ مختصر سا مضمون اس موضوع کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آخرت میں یہاں کے اعمال کے نتائج برآمد ہونا' اسلامی حکومت کی بنیاد ہے اگر آخرت میں نتائج برآمد ہونے پر ایمان نہ لایا جائے تو پھر تو اسلامی حکومت برپا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ آخرت میں نتائج برآمد ہونے کی وجہ سے' ایمان بالآخرۃ' اسلامی حکومت کی بنیاد بن جاتا ہے۔

قرآن کریم کے بیان کردہ دین کے پانچ اجزاء کا بیان یہاں ختم ہوا لیکن ہم مسلمانوں میں والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ۔ یعنی خیر و شر سب اللہ کی طرف سے ہے' کا بھی اضافہ کیا جاتا ہے جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور اس طرح انسان کو تقدیر کا پابند اور مجبور محض بنا دیا جاتا ہے۔

مولوی محمد علی مرحوم' نے راقم سطور سے فرمایا تھا کہ یہ ٹکڑا بے شک قرآن میں ایزادو اضافہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام بطور دین کے جاری تھا اس وقت اس کا درست مفہوم اخذ کیا جاتا ہوگا' اب جبکہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کا مفہوم بھی بدل دیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس وقت اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ خیر و شر کے سب پیمانے اللہ تعالیٰ کے ہی مقرر کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق خیر و شر روبہ عمل ہوتے ہیں۔

دین کے یہ پانچوں اجزاء آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ہم سب مسلمان ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان اجزاء پر ایمان لانے کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اگرچہ مذہب میں ان کے نتائج بالکل برآمد نہیں ہو رہے ہیں جب ان کو بحیثیت دین روبہ عمل لائیں گے تو ان کے نتائج یقیناً برآمد ہوں گے۔

قارئین طلوع اسلام کو بخوبی علم ہے کہ ہمارے ہاں ایک ہزار سال سے سب لٹریچر بحیثیت مذہب کے تحریر کیا گیا ہے اور تقریباً اس سارے لٹریچر میں دین کی ایک

رمق بھی خوردبین لگا کر دکھائی نہیں دیتی۔ جب حالات یہ ہوں تو ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں ان سب اجزاء ایمان کو بھی محض بحثیت مذہب کے ہی سمجھا بھی گیا اور اسی طرح ان پر عمل بھی کیا گیا۔ لیکن آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان اجزاء کو بحثیت دین کے پیش کیا جائے۔ ان پانچوں اجزاء پر بحثیت دین الگ الگ مبسوط مضامین تحریر کئے جائیں۔ تحریر کرنے والے کے لئے سابقہ اور موجودہ لٹریچر میں اس کے لئے کوئی مواد دستیاب نہیں ہو گا۔ اسے خود ہی اس معاملہ میں سخت محنت کرنی ہو گی۔ اور محنت بھی بہت زیادہ درکار ہو گی۔ یہ کام صرف وہی شخص کر سکتا ہے (۱) جس کے سامنے دین کا تصور بالکل واضح ہو (۲) جسے دین کے قیام کی تڑپ رات دن بے قرار کئے ہوئے ہو (۳) اور سب سے زیادہ یہ کہ اس میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ اس موضوع سے (Full Justice) نبھا سکے۔ جو شخص بھی یہ کام کرے گا وہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے گا۔

وھٰذا تم منا الکلام

علی مصطفنا الوف سلٰم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاء الحق قاسمی

عالم اسلام اور دولے شاہ کے چوہے!

ان دنوں تاریخ لکھنے والے تو کجا تاریخی ناول لکھنے والے بھی کمیاب ہیں ان حالات میں جمیل یوسف شاعری کی خواب آور گلیوں میں گھومتے گھومتے تاریخ کی سنگلاخ حقیقتوں کے کوچے کی طرف نکل آئے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ لکھ ماری ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے پہلا بہتر کام یہ کیا کہ اسے اسلام کی تاریخ قرار دینے کی بجائے ''مسلمانوں کی تاریخ'' قرار دیا اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ''تاریخ اسلام'' تو زیادہ سے زیادہ خلافت راشدہ تک ہے' اس کے بعد ''مسلمانوں کی تاریخ'' شروع ہو جاتی ہے' اس ضمن میں دوسرا اچھا کام یہ تھا کہ انہوں نے تاریخ کے طومار لکھنے کی بجائے ڈاکٹر سلیم اختر کی معرکتہ الآرا اختراع یعنی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے اتباع میں مسلمانوں کی مختصر ترین تاریخ قاری کے سپرد مطالعہ کی تاکہ ایک تو وہ کم سے کم وقت میں اسے پڑھ سکے اور کچھ سیکھ سکے اور دوسرے علمی بدہضمی کا بھی شکار نہ ہو اور یوں سچ پوچھیں تو خود مجھے بھی پہلی بار مسلمانوں کی تاریخ پڑھنے کا حوصلہ ہوا۔ ورنہ میں کئی بار یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ چکا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ پڑھنا بیک وقت ایک خوشگوار اور ناخوشگوار تجربہ ہے' اس میں قتل و غارت گری بھی ہے اور اقتدار کے حصول کے لئے رشتوں سمیت سبھی قدروں کی پامالی کا عنصر بھی موجود ہے' اس لحاظ سے یہ تاریخ صرف مسلمانوں کی نہیں' ایک پورے انسانی دور کی تاریخ کی عکاس بھی ہے کہ اقتدار کے حمام میں سبھی مذاہب کے حامل افراد ننگے دکھائی دیتے ہیں' یہ سب کچھ تاریخ کے تاریک ادوار (Dark Ages) میں بھی ہوتا تھا اور آج اکیسویں صدی میں عین ہماری ناک کے نیچے بھی ہو رہا ہے' تاہم مسلمانوں کی تاریخ میں بہت تابناک ابواب بھی آتے ہیں' ان کے ہاں بیشتر صورتوں میں جنگ اور امن کے آداب ملحوظ رکھے گئے ہیں' مفتوحہ علاقوں میں کھڑی فصلوں' گھروں اور دوسری عمارتوں کو نقصان نہ پہنچانے کی مثالیں موجود ہیں۔ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو جان کی امان دی جاتی رہی ہے' اقلیتوں کے حقوق اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام بھی مسلمانوں کی تاریخ میں ملتا ہے اور یوں تاریخ کا قاری اگر بہت سے مقامات پر بدمزہ ہوتا ہے تو ایسے بہت سے مقامات بھی

سامنے آتے ہیں جہاں مسلمانوں کی اخلاقی برتری بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

تاہم اس کتاب کے مطالعہ کے دوران جس ایک چیز نے مجھے خصوصی طور پر بہت حیران کیا' وہ ایک طرف تو مسلمانوں کی بے پناہ فتوحات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے' وہ ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔اس دوران وہ اغیار سے بھی نمٹتے ہیں اور باہمی جنگ و جدل کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے مگر دوسری طرف اس مارا ماری کے باوجود مسلمانوں کی علمی فتوحات کا شاندار سلسلہ بھی جاری وساری رہتا ہے' وہ فنون لطیفہ میں نام پیدا کرتے ہیں' فن تعمیر کے کمالات دکھاتے ہیں' سائنس اور فلسفہ میں نئی تھیوریاں سامنے لاتے ہیں' وہ عالیشان یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں' جدید شہری نظام کی بنیادیں رکھتے ہیں چنانچہ جب لندن اور پیرس کی گلیاں کیچڑ سے بھری ہوتی تھیں اور سرشام اندھیروں میں ڈوب جاتی تھیں' وہاں غرناطہ اور بغداد قمقموں سے جگمگا رہے ہوتے تھے اور ان کے گلی کوچے جنت نشاں نظر آتے تھے۔ملکوں کی فتوحات کا سلسلہ ابھی بہت بعد تک جاری رہتا ہے مگر علم کے محاذ پر مسلمان رفتہ رفتہ پسپا ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ وہ مقام ہے جب اقبالؒ کے لفظوں میں عجمی اسلام' عربی اسلام پر غالب آنا شروع ہوتا ہے اور پھر ہم ذہنی پسماندگی' تنگ نظری اور مسخ شدہ اسلام کی پیروی کرتے کرتے موجودہ حالت تک پہنچتے ہیں۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران میں نے اس عروج و زوال کی وجوہ جاننے کی کوشش کی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارا اجتماعی زوال' ہمارے فکری زوال سے شروع ہوتا ہے' جب مسلمان اسلام کی صحیح روح سے آشنا تھے' اس وقت ان کے ذہن کشادہ تھے چنانچہ عروج کے دنوں میں کوئی نظریہ ایسا نہ تھا جسے عقیدے کی شکل دے کر اس پر بحث مباحثے کے دروازے بند کر دیئے گئے ہوں چنانچہ اس دور میں ایسے ایسے مسائل پر کھلی بحثیں پڑھنے کو ملتی ہیں جن کا ذکر بھی ان دنوں ممنوع ہے' قرآن کے خلق یا مخلوق ہونے کی بحث بھی بغیر کسی فتوے کے ہوتی تھی' معتزلہ اور خوارج کے عقائد بغیر کسی فتنہ وفساد کے پرکھے جاتے تھے اس کے علاوہ بہت سے ''کفریہ'' عقائد ایسے تھے جن پر دونوں طرف کے علماء اپنے اپنے دلائل دیتے تھے اور اس فکری آزادی کا نتیجہ علم کے مختلف شعبوں جن میں سائنس بھی شامل ہے' نئے خیالات اور نئے نظریوں کی صورت میں سامنے آیا۔

جبکہ آج صورتحال یہ ہے کہ اپنے ذہن سے سوچنے کی آزادی سلب کر لی گئی ہے' بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے سر پر اپنے نظریات کا کلبوت چڑھا دیتے ہیں' جس کے نتیجے میں اس کا سر چھوٹا اور منہ بڑا ہو جاتا ہے اور یوں عالم اسلام میں ہر طرف دولے شاہ کے چوہے نظر آتے ہیں' اس علمی اور فکری گھٹن اور جبر کی صورت حال کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ میرا چھوٹا بیٹا علی قاسمی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ہسٹری میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے' اسکا تھیسز اہل قرآن پر ہے' وہ ریسرچ کے لئے ان دنوں لاہور کے کتاب خانوں کے چکر لگا رہا ہے مگر اسے * عبداللہ

چکڑالوی، احمد دین امرتسری، غلام احمد پرویز، اسلم جیراجپوری اور اس فکر کے دوسرے مبلغین کی کتابیں ملنے میں شدید دشواری پیش آرہی ہے، ایک بک سیلر سے اس موضوع پر کتابیں ملنے کی امید تھی مگر اس نے علی کو بہت درشت لہجے میں کہا کہ اس کے پاس اس قسم کی کوئی کتاب نہیں ہے، علی کو یقین تھا کہ اس کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں چنانچہ وہ دوسرے دن دوبارہ اس کے پاس گیا تو اس نے ایک خفیہ خانے سے یہ کتابیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں اور اپنے پہلے رویئے پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ایک مولوی صاحب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اگر وہ ان کے سامنے یہ کتابیں نکالتا تو اسی دن اس کی دکان کو آگ لگا دی جاتی۔

کیا اس صورتحال میں مسلمان کی نشأۃ ثانیہ کا خواب دیکھا جا سکتا ہے؟ کیا شکنجے میں جکڑے ہوئے دماغوں کو آزاد کئے بغیر ہم یورپ کی علمی برتری کا جواب دے سکتے ہیں اور کیا اس کے بغیر ہم صرف تلوار سے اہل مغرب کی غلامی اور ان کے ظلم و جور کی شکار مسلم امہ کی دستگیری کر سکتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب یقیناً ''نہیں'' میں ہے شاہ ولی اللہؒ اور اقبالؒ کے ماننے والے ان جہلاء کے پیروکار بن گئے ہیں جن کے عمامے جن کے سروں سے بڑے ہیں۔ عالم اسلام دولے شاہ کے چوہوں کے نرغے میں ہے، اگر ہم اپنی عظمت رفتہ کی بحالی چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے آزادیٔ فکر کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔ ہماری موجودہ پستی کا اس کی سوا اور کوئی علاج نہیں!

(بشکریہ جنگ بابت 7 جنوری 2006ء)

(*اس جملے سے یہ تاثر مل سکتا ہے کہ جیسے یہ سب حضرات ایک ہی فکر سے منسلک ہوں اس لئے واضح کر دینا ضروری ہے کہ پرویز علیہ الرحمتہ یا طلوع اسلام کا اہلِ قرآن سے یا کسی اور فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی یہ خود کوئی الگ فرقہ یا جماعت ہے۔ ادارہ)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد نجات اللہ صدیقی
اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹیٹیوٹ
اسلامی ترقیاتی بنک' جدہ' سعودی عرب

معاصر اسلامی فکر اور مقاصدِ شریعت

(ماخوذ' بلا تبصرہ)

مقاصد شریعت کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں فیصلہ کرنے کے موضوع پر ہم گذشتہ نصف صدی کا جائزہ لیں گے' تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ یہ موضوع کتنا اہم ہے اور ہم آئندہ اس کے بارے میں بہتر طور پر سوچ سکیں۔ ذیل میں تین طرح کی مثالیں دی جائیں گی۔

۱۔ ایسے مسائل جن میں سابقہ ''فتویٰ'' کے مقاصد شریعت سے مغایر ہونے کی وجہ سے رجوع کر لیا گیا اور ایک نئی رائے اختیار کر لی گئی۔ اس کی مثال کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کا موضوع ہے۔

۲۔ ایسے مسائل جن میں زیادہ تر لوگوں کو پرانے فتاویٰ پر اصرار ہے' جبکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب یہ فتاویٰ مقاصد شریعت کے خادم نہیں رہے۔ صدقۂ فطر میں چند مقررہ اجناس دینے پر اصرار اور ہر حالت میں عورت کے سفر کے لئے محرم کی ہم راہی پر اصرار اس کی مثالیں ہیں۔

۳۔ ایسے مسائل جن میں بعض مجالس فقہ کے دیے ہوئے فتوے مقاصد شریعت کے منافی ہیں' جیسا کہ بعض علماء نے واضح کیا ہے۔ قطبین پر نماز روزے کے اوقات کی تعیین کا طریقہ اور اسلامی مالیاتی اداروں کا ''تورّق'' کے طریقہ پر عمل اس کی مثالیں ہیں۔

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت: مسلمان معاشروں میں جب کرنسی نوٹ کا رواج بڑھا تو غالباً نوٹ پر لکھی عبارت کی روشنی میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ کرنسی نوٹ ''مال نہیں محض سندِ مال ہے''۔ (۱۲) جیسا کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۱۹۸۹ء سیمینار کی روداد پڑھنے والوں پر واضح ہوگا' اس رائے کو اختیار کرنے سے کرنسی نوٹ کی شکل میں موجود بچت پر زکوٰۃ کی فرضیت' کرنسی نوٹ کی شکل میں ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی ادائیگی' نیز کرنسی نوٹ کی شکل میں ادھار دی جانے والی رقموں پر سود سے متعلق احکام کا اطلاق وغیرہ بہت سے مسائل پر اثر پڑتا ہے۔ ان نتائج کو بدیہی طور پر شریعت کے منشا اور مقصد کے خلاف پا کر علماء نے اپنی رائے بدل دی جیسا کہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہے:

''نوٹوں اور سکوں کے مسئلہ میں بھی ضروری ہے کہ اسلام کے اس تصورِ عدل کو کلیدی اہمیت دی جائے اور فقہی جزئیات اور قدیم فقہاء کے اجتہادات کو ثانوی۔ اس لئے کہ فقہاء کی آراء اپنے عہد اور زمانہ کے اعتبار سے عین عادلانہ تھیں، مگر ضروری نہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی اقامتِ عدل کے لئے کفایت کر سکیں'' (۱۳)۔

''کرنسی نوٹوں کا مسئلہ بھی حالات اور عرف و عادت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے اور سو سال پہلے جو حکم تھا ہر حال میں وہی باقی نہ رہے گا، بلکہ اس میں تبدیلی ہو گی''۔(۱۴)

''اگر نوٹوں میں تفاضل کو جائز قرار دیا گیا تو سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا اور وہ ساری بندشیں پامال ہو کر رہ جائیں گی جو سود پر باندھی گئی ہیں''۔(۱۵)

جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے چونکہ کرنسی نوٹ کو ''سند'' کی جگہ ''ثمن'' قرار دینے کا فیصلہ کسی منطقی اساس پر نہیں، بلکہ مصالح کی روشنی میں کیا گیا ہے، اس لئے بعض علماء مخصوص حالات میں سابق رائے پر عمل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ ان حالات میں کرنسی نوٹ کو سند قرار دے کر عدل کے تقاضوں کو آسانی سے پورا کیا جا سکتا ہے:

''جہاں معاملہ ادھار اور مؤجل ہو وہاں سند اور وثیقہ کی حیثیت کا لحاظ ہونا چاہئے، کیوں کہ ایک خاص مدت کے بعد ان کی قدر و مالیت میں یقیناً قابل لحاظ تفاوت ہو جاتا ہے جو ضرر اور اتلاف حق کو مستلزم ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ اس کا لحاظ نہ رکھنا یقیناً اسلام کے قانون عدل سے میل نہیں کھاتا'' (۱۶)۔

کسی زمانہ میں، کسی جگہ پر، وہاں کے حالات میں عدل کا تقاضا کیا ہے۔ اس کا جواب ہمیں نص میں نہیں مل سکتا، نہ قیاس کے ذریعہ اس کا جواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں عدل کے تقاضے کی تحدید ہماری عقل ہی کر سکتی ہے۔ البتہ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ کسی ایک آدمی کی عقل پر بھروسہ کرنے کے بجائے بہت سے لوگوں کی رائے لی جائے، خاص طور پر ان لوگوں کی جو حالات سے مسلسل تعامل اور اپنے تجربہ کی بنیاد پر رائے دینے کے زیادہ اہل ہوں۔ جیسا کہ ہم آئندہ واضح کریں گے، ایسے معاملات کو اجتماعی اجتہاد اور باہمی مشاورت کے ذریعہ طے پانا چاہئے۔

عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا: علامہ یوسف قرضاوی اپنی کتاب كيف نتعامل مع السنة النبويه: معالم و ضوابط (مطبوعہ ریاض، مکتبۃ المؤید ۱۹۹۱ء) میں ''فهم الأحاديث فی ضوء أسبابها و ملابساتها و مقاصدها'' (احادیث کو ان حالات اور اسباب کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت جن کے بارے میں وہ آئی ہیں، نیز ان کے مقاصد کو سامنے رکھنے کی ضرورت) کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اسی قبیل کی بات وہ ہے جو بخاری اور مسلم کی روایت

کردہ مرفوع حدیث میں ابن عباسؓ اور دوسرے لوگوں کے حوالہ سے آئی ہے کہ (نبی ﷺ نے فرمایا) ''عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے'' اس پابندی کی وجہ یہ ڈر ہے کہ اگر عورت اپنے شوہر یا کسی قریبی رشتہ دار کے بغیر اس زمانہ میں سفر کرتی جب اونٹ یا خچر پر بیٹھ کر مسافت طے کی جاتی تھی اور اس حال میں وہ ایسے دشت وصحرا سے گذرتی جس میں نہ آدمی نہ آدم زاد' تو ایسے سفر میں اگر عورت کو کوئی واقعی گزند نہ بھی پہنچتا تو بھی لوگ اسے شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ لیکن اگر حالات بدل جائیں' جیسا کہ ہمارے زمانہ میں واقعتاً بدل چکے ہیں اور سفر' مثال کے طور پر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہو جس میں سو یا زیادہ مسافر بیٹھے ہوں' یا ریل گاڑی سے ہو جس میں سینکڑوں لوگ ساتھ ہوں اور عورت کے اس طرح اکیلے سفر کرنے میں کوئی خطرہ باقی نہ رہے تو شرعاً اس کے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں' نہ اس کا ایسا کرنا حدیث کے خلاف عمل شمار ہوگا'' (۱۷)۔

صدقۂ فطر کی نقد کی شکل میں ادائیگی:

علامہ یوسف قرضاوی اپنی محولہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں:

''سنت کے الفاظ کی پابندی بعض اوقات سنت کی روح اور اس کے مقصد کی پابندی کے بجائے اس کے منافی ہوتی ہے' باوجود ظاہراً اس کے مطابق عمل کے' اس کی ایک مثال بعض لوگوں کا اس پر شدید اصرار ہے کہ صدقۂ فطر نقد کی صورت میں نہ ادا کیا جائے' جب کہ ایسا کرنے کی اجازت ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب دیتے ہیں اور اس کی اجازت عمر بن عبدالعزیزؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے یہاں ملتی ہے۔

شدت اختیار کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے بعض متعین اجناس کا نام لیا تھا: کھجور' منقی' گیہوں اور جو۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں چاہئے کہ وہی کریں جو آپؐ نے کرنے کو کہا ہے اور اپنی رائے سے سنت کی مخالفت نہ کریں۔ ہمارے یہ بھائی لوگ اگر غور فرمائیں جیسا کہ انہیں کرنا چاہئے تو ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ درحقیقت نبی ﷺ کی مخالفت وہ کر رہے ہیں' اگرچہ وہ بظاہر ان کے حکم پر عمل پیرا ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے سنت کے جسم کو پکڑ رکھا ہے اور اس کی روح کو بھلا دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو زمانہ اور صورت حال کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے صدقۃ الفطر ایسی اجناس کی صورت میں عائد کی جو لوگوں کے پاس پائی جاتی تھیں۔ ان کی ادائیگی دینے والے کے لئے بھی آسان تھی اور لینے والوں کے لئے بھی مفید تھی۔ عربوں کے درمیان اور خاص طور پر دیہات والوں کے پاس نقد سکوں کا رواج کم تھا۔ کھانے کی اجناس دینا ان کے لئے آسان تھا اور محتاجوں کو انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ اسی لئے صدقہ ان اجناس کی صورت میں دینے کا حکم دیا گیا جو آسانی سے میسر تھیں۔ یہاں تک کہ آپ

نے (صدقہ میں) پنیر دینے کی بھی اجازت دے دی (پنیر مکھن نکالے ہوئے دودھ کو سکھانے سے بنتی ہے) یہ اجازت ان لوگوں کی رعایت سے دی گئی تھی جن کو اس میں آسانی تھی' مثلاً دیہاتوں میں اونٹ' بھیڑ بکری اور گائے چرانے والے۔ جب صورت حال بدل جائے' نقد آسانی سے میسر ہو اور اجناس مذکورہ اتنی آسانی سے نہ دستیاب ہوں' یا فقیروں کو عید میں جنس کی ضرورت نہ ہو' بلکہ وہ اپنے اور اہل وعیال کے لئے دوسری چیزوں کے محتاج ہوں تو نقد کی صورت میں صدقہ دینا دینے والے کے لئے بھی زیادہ آسان ہے اور لینے والے کے لئے بھی زیادہ مفید۔ یہی طریقہ نبی ﷺ کی ہدایت اور ان کے مقصود کے مطابق قرار پائے گا۔'' (یوسف قرضاوی ایضاً)۔

قطبین کے علاقوں (Polar Regions) میں نماز روزہ کے اوقات:

میں نماز روزہ کے اوقات: مجمع فقہی' رابطۂ عالم اسلامی' مکہ مکرمہ نے اس مسئلہ کے بارے ایک قرارداد پاس کی ہے۔ تمہید کے بعد قرارداد کی عبارت درج ذیل ہے:

''جو کوئی ایسے ملکوں میں رہتا ہو جن میں رات اور دن میں فرق طلوع فجر اور غروب آفتاب کی بنا پر واضح ہو مگر ان کے دن گرمی میں بہت لمبے اور جاڑے میں چھوٹے ہوتے ہوں' ایسے آدمی پر فرض ہے کہ پانچوں اوقات کی نمازیں ان کے شرعی طور پر معروف اوقات میں ادا کرے۔''

اس کے بعد سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۸ اور سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۰۳ نقل کی گئی ہیں جن کے ترجمے درج ذیل ہیں:

''(اے محمدؐ) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر' عصر' مغرب' عشاء کی) نمازیں اور صبح کو قرآن پڑھا کرو۔ کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔(۱۹)۔

''...... بے شک نماز فرض ہے مسلمانوں پر اپنے مقررہ وقتوں میں''۔(۲۰)۔

ان آیات کے بعد چند احادیث نقل کی گئی ہیں' جن کے ترجمے درج ذیل ہیں:

''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے آپ سے نماز کا وقت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ دو' ہمارے ساتھ نماز پڑھو' مراد تھی دو دن۔ جب سورج ڈھل گیا تو آپ نے بلالؓ سے کہا: انہوں نے اذان دی' پھر ان کو کہا تو انہوں نے ظہر کی اقامت کہی۔ اس کے بعد ان سے پھر کہا تو انہوں نے عصر کے لئے اقامت کہی' پھر سورج ڈوب گیا تو آپ کے کہنے پر انہوں نے مغرب کی اقامت کہی۔ شفق ڈوب جانے کے بعد آپ کے حکم سے انہوں نے عشاء کی اقامت کہی۔ اس کے بعد آپؐ

کے حکم فرمانے پر فجر طلوع ہوتے ہی نماز فجر کی اقامت کہی، پھر دوسرا دن شروع ہوا تو آپ کے کہنے کے مطابق انہوں نے ٹھنڈا ہو جانے پر ظہر کی نماز کے لئے اقامت کہی اور ٹھنڈے وقت (میں پڑھنے) کو نعمت قرار دیا۔ آپ نے عصر ایسے وقت میں پڑھی کہ سورج کا آخری حصہ (افق سے) تھوڑا ہی اوپر تھا اور مغرب بھی دیر کر کے شفق غائب ہونے پر پڑھی، نیز عشاء کی نماز تہائی رات گذرنے کے بعد اور فجر اجالا ہونے کے بعد پڑھی، پھر آپ نے پوچھا ''وہ صاحب کہاں ہیں جنہوں نے نماز کے اوقات دریافت کئے تھے؟'' تو وہ صاحب بولے: وہ میں ہوں یا رسول اللہ، تو آپ نے فرمایا: تمہاری نمازوں کا وقت ان (اوقات) کے درمیان میں ہے جو تم نے دیکھے''۔ یہ روایت مسلم کی ہے۔

''حضرت عمرو بن العاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ظہر کا وقت زوال آفتاب سے (شروع ہوتا) ہے جب آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو، اس وقت تک جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے اور عصر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک دھوپ پیلی نہ پڑ جائے، مغرب کا وقت شفق غائب ہونے تک ہے اور عشاء کا وقت بیچ رات تک ہے، فجر کا وقت طلوع فجر سے سورج نکلنے تک ہے۔ جب سورج نکل آئے تو نماز نہ پڑھو، کیوں کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان نکلتا ہے''۔

یہ حدیث مسلم نے اپنی صحیح میں لکھی ہے۔

''اس کے علاوہ بھی حدیثیں ہیں جو اوقات نماز کی تحدید کے بارے میں آئی ہیں، زبانی بیان کے انداز میں اور عملی طور پر۔ ان حدیثوں نے دن کے لمبے یا چھوٹے ہونے کے درمیان فرق نہیں کیا، نہ رات چھوٹی بڑی ہونے کے درمیان تفریق برتی، جب تک کہ نمازوں کے اوقات کو رسول اللہﷺ کی بیان کردہ علامات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے دیکھا جا سکے''۔

اس عبارت کے بعد روزے کے احکام ہیں، کہ جب تک دن اور رات میں فرق ممکن ہو، دن کے چھوٹے یا بڑے ہونے کا لحاظ کئے بغیر دن بھر کا روزہ رکھنا ہوگا، البتہ ناقابل برداشت حالات میں افراد استثنائی احکام اختیار کر سکتے ہیں۔

اس مجلس کے ایک رکن شیخ مصطفیٰ زرقاء (وفات ۱۹۹۹ء) نے اس فتویٰ سے اختلاف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''اس موضوع پر میری رائے اس قرارداد کے خلاف تھی، کیوں کہ جن ملکوں میں دن اور رات کا مذکورہ بالا فرق واضح ہوتا ہے ان میں اس فرق کی مدت کبھی کبھی آدھا گھنٹہ یا ایک گھنٹہ کے بقدر ہی ہوتی ہے۔ یعنی رات ۲۳ گھنٹے کی اور دن صرف گھنٹہ بھر کا۔ جاڑے میں ایسا اور

گرمی میں اس کے برعکس۔ جس حدیث کی بنیاد پر یہ قرارداد پاس کی گئی ہے اس کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں جزیرۃ العرب کے لوگوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ حدیث میں اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کہ دور دراز کے شمالی جنوبی علاقوں میں دن اور رات کے اوقات میں جو زبردست فرق پایا جاتا ہے وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ اس حدیث میں ایسے علاقوں کے بارے میں حکم نہیں دیا گیا ہے' ایسی صورت میں ضروری ہے کہ ایسا حکم اختیار کیا جائے جو مقاصد شریعت سے مناسبت رکھتا ہو۔ دن اور رات کے درمیان فرق واضح ہونے کی جس عمومی بنیاد پر یہ قرارداد مبنی ہے' جس میں اس زبردست فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو دن اور رات کی مدتوں کے مابین پایا جاتا ہے' مقاصد شریعت کے بالکل منافی ہے اور اس قاعدہ کے بھی خلاف ہے کہ حرج دور کیا جانا ضروری ہے''۔

''یہ بات کسی طرح معقول نہیں کہ دن یا رات کی ساری نمازوں کو' مثال کے طور پر' آدھے گھنٹے کے اندر اندر پڑھ لیا جائے نہ یہ معقول ہے کہ ایک گھنٹہ کا روزہ رکھا جائے اور ۲۳ گھنٹے کھانے پینے کی اجازت ہو' یا اس کے برعکس۔'' (۲۱)

ہمارے لئے ضروری نہیں کہ شیخ مصطفیٰ زرقاء کے تجویز کردہ حل کو بھی نقل کریں' یا اس پر بحث کریں۔ ہمارا مقصد اس مخصوص مسئلہ کی تنقیح نہیں' بلکہ یہ بتانا ہے کہ بعض اوقات بڑی پختہ دلیلوں پر مبنی فیصلے' جن کو وقت کے بعض ممتاز علماء اور فقہاء کی تائید حاصل ہو' مقاصد شریعت سے مغائر ہو سکتے ہیں۔ ہمارے سوچنے کا مدار یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فتویٰ کس نے دیا ہے' بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ فتویٰ مقاصد شریعت سے ہم آہنگ ہے کہ نہیں۔

طویل المیعاد ٹھیکوں میں ادائیگیاں: اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے کہ مذکورہ بالا فقہی مجلس مقاصد شریعت کی روشنی میں سوچنے کی جگہ ہمیشہ ہر حال میں نصوص سے استدلال اور قیاس پر ہی تکیہ کرتی ہو گی ہم اسی مجلس کی ایک اور قرارداد کی آخری سطریں نقل کریں گے۔ (۲۲) اس قرارداد کا تعلق کاروباری ٹھیکوں اور معاہدوں کے ضمن میں عائد ہونے والی ذمہ داریوں اور ان سے متعلق حقوق پر' حالات میں واقع ہونے والی غیر متوقع تبدیلیوں سے ہے۔ ایسی صورت حال ان کاموں کے سلسلہ میں پیش آتی ہے جن کی تکمیل کے لئے لمبی مدت درکار ہوتی ہے' جیسے کسی بہت بڑی بلڈنگ کی تعمیر کا ٹھیکہ' یا کسی ہسپتال وغیرہ میں بعض اشیاء استعمال کی مسلسل فراہمی کا ٹھیکہ وغیرہ۔ پورے کام کا معاوضہ ابتدا ہی میں طے ہو جاتا ہے' جب کہ متعلقہ اشیاء یا خام مواد کی قیمتوں اور مزدوریوں میں وقت کے ساتھ غیر معمولی اتار چڑھاؤ واقع ہو سکتا ہے۔ مجلس نے ایسی صورت میں معاہدہ میں عدالت کے توسط سے ایسی تبدیلیوں کی اجازت دی ہے جو فریقین کے درمیان عدل و انصاف بحال کر سکیں۔ قرارداد کے پورے متن کا

حوالۂ بالا کی مدد سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ہماری دلچسپی کا باعث یہ آخری فقرہ ہے۔

> ''مجلس فقہی اس حل کو جو شریعت کے اصولوں کی مدد سے نکالا گیا ہے' معاہدہ کے دونوں فریقوں کو اس انصاف کی ضمانت دینے والا سمجھتی ہے جو ہم پر فرض ہے۔ اس طرح کسی ایک فریق کو ایسے اسباب کی بنا پر' جن کے پائے جانے میں اس کا کوئی دخل نہیں' ناقابل برداشت نقصان اٹھانے سے بچایا جاسکتا ہے۔ یہ حل حکمت سے لبریز شرعی فقہ کے مطابق اور شریعت کے قواعد اور مقاصد عامہ نیز اس کے عدل سے قریب تر ہے۔''

قرارداد کے یہ الفاظ شاہد ہیں کہ اس مخصوص مسئلہ میں مجلس نے عدل وانصاف کی ضمانت دینے اور مقاصد شریعت کو ملحوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہے' جس کے نتیجہ میں وہ ایک قابل قبول رائے تک پہنچی ہے' جب کہ اسی مجلس نے ایک دوسرے مسئلہ میں ایک ایسی رائے اختیار کی جو' جیسا کہ شیخ مصطفیٰ زرقاء نے لکھا ہے' معقول اور قابل عمل نہیں معلوم ہوتی۔ ہم یہ بات اس لئے نوٹ کررہے ہیں کہ نئے پیش آنے والے مسائل میں بار بار ایسی صورت حال کا سامنا ہوگا' ضروری ہے کہ اس میں سب کے لئے قابل قبول آراء تک پہنچنے کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہمارے اختیار کا مدار فتویٰ دینے والے اشخاص پر نہیں' طریقہ (Process) پر ہونا چاہئے۔

تورق: فقہی استدلال کے ذریعہ ''حکم شرعی'' کی دریافت کی ایک ایسی مثال' جو اپنے نتائج کی بنا پر ہمارے نزدیک مقاصد شریعت سے مغائر ہے' 'تورق' کا وہ صیغہ ہے جو بعض اسلامی مالیاتی اداروں نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ طریقہ طلب گاروں کو نقد فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ نقد تمویل کا طلب گار کسی ایسے اسلامک بنک کے پاس جائے جو تورق پر عمل پیرا ہو تو اس کی مشکل حل ہوسکتی ہے۔ وہ بنک کے توسط سے کوئی چیز...... موٹر کار' یا پلاٹینم کی ایک مقدار...... ادھار خریدتا ہے۔ اس عمل کے نتیجہ میں وہ بنک کا' ایک متعین رقم (مثلاً ۵ لاکھ) کا دین دار ہو جاتا ہے جو اسے طے شدہ مدت میں ادا کرنا ہے۔ دوسرا عمل اس چیز کو بنک کے توسط سے نقد کے عوض' مثلاً چار لاکھ میں فروخت کرنا ہے۔ اس طرح وہ چیز اپنے مالک کے پاس واپس پہنچ جاتی ہے' نقد کے طلب گار کو نقد مل جاتا ہے' مگر وہ اس رقم سے زیادہ رقم کا مقروض ہو جاتا ہے جو اسے ملی ہے۔ بنک کے لئے یہ ایک نفع بخش کاروبار ہے کیوں کہ اسے تھوڑا نقد ادا کرکے' کچھ عرصہ بعد' زیادہ نقد ملنے والا ہے۔

جو لوگ فقہی استدلال کی بنا پر 'تورّق' کے جواز کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ مثال میں دونوں عمل الگ الگ جائز ہیں' کسی چیز کو ادھار خریدنا اور اسی چیز کو نقد کے عوض فروخت کرنا۔ اگر پہلا معاملہ (Contract) دوسرے سے مشروط نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ان معاملات کو ناجائز قرار دیا جائے۔ اس فقہی استدلال کے جواب میں فقہی استدلال کی بنا پر تورق کو

ناجائز قرار دینے والے اسے ''عینہ'' (۲۵) کے برعکس معاملہ قرار دیتے ہیں اور عینہ اور اس کے برعکس معاملہ دونوں حرام ہیں' چنانچہ شیخ مصطفیٰ زرقاء نے لکھا ہے کہ ''علماء نے صراحت کی ہے کہ حرمت کے معاملہ میں عینہ اوراس کا الٹا عمل دونوں برابر ہیں کیوں کہ احادیث میں یہی بتایا گیا ہے۔'' (۲۶)

بہت سے نئے مسائل کی طرح ''تورّق'' کے مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ جزئی (Micro) سطح پر فقہی استدلال کی روشنی میں جواز یا عدم جواز' اور کلی (Macro) سطح پر اس سے حاصل ہونے والے مصالح اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد کا موازنہ۔ اس موضوع پر ابھی تک جو تحریریں سامنے آئی ہیں وہ زیادہ تر پہلی قسم کی ہیں۔ زیادہ تر بحثیں جزئی استدلال اور انفرادی سطح پر تجزیہ و تحلیل (Mirco Analysis) تک محدود ہیں۔

اسلامی معاشیات پر اب تک کے لٹریچر میں سودی لین دین کے برے نتائج کے بیان میں چند اہم باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱۔ سود پر قرض دینے کے رواج کے نتیجہ میں قرض پر مبنی سندات و تمسکات کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ معیشت میں حقیقی اشیاء اور خدمات (Real goods and services) کی نسبت سے قرض پر مبنی کاغذات کے حجم کا بڑھتے رہنا بازار زر (Money market) میں سٹہ بازی کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ لوگوں کی محنت اور ذہانت اشیاء و خدمات کی پیداوار کے ذریعہ نفع کمانے کے بجائے مالیاتی بازار میں سٹہ بازی (Speculation) کے ذریعہ نفع کمانے میں صرف ہونے لگتی ہے۔

۲۔ جس معیشت میں زر کی مقدار قرض کی مقدار سے وابستہ ہو وہ عدم استقرار کا شکار رہتی ہے۔ جب بھی کوئی بنک ''قرض'' دیتا ہے معیشت میں زر کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے قرض کی مقدار بڑھتی ہے زر کی مقدار بھی بڑھتی ہے۔

۳۔ انسان کا ماحول صرف مرور زمانہ کی بنا پر نقد سرمایہ میں بڑھوتری کی ضمانت نہیں دیتا۔ نقد سرمایہ کو پیداوار (Production) اسی صورت میں بنایا جا سکتا ہے جب اس سے حقیقی اشیاء اور خدمات خریدی جائیں' وہ پیداواری عمل سے گذریں' پھر نتائج پیداوار کو نقد کے عوض فروخت کیا جائے۔ یہ عمل پر خطر ہے' ضروری نہیں کہ آخر میں جو نقد آیا وہ شروع میں لگائے ہوئے نقد سے زیادہ ہو۔ بنابریں تھوڑا نقد دے کر کچھ مدت کے بعد زیادہ نقد کا مطالبہ یعنی سودی قرض عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

۴۔ جس معاشرہ میں تھوڑا نقد دے کر زیادہ نقد لینے کا طریقہ عام طور پر رائج ہوتا ہے اس میں دولت اور آمدنی کی تقسیم دن بدن زیادہ ناہموار ہوتی جائے گی' یعنی عدم مساوات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہ صورت حال معاشی توازن' سماجی ہم آہنگی اور امن و امان کے لئے خطرہ ہے۔

مذکورہ بالا لٹریچر میں ان نکات کے علاوہ بھی نکات سامنے آئے ہیں جن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (۲۷) یہاں ہم

اسی قدر پر اکتفا کریں گے۔ چونکہ ہمیں صرف اس بات پر زور دینا ہے کہ 'تورق' کا چلن عام ہوتو وہی صورت حال پیدا ہوگی جو سودی قرض کے رواج سے پیدا ہوتی ہے جس کے مفاسد کا اسلامی معاشی لٹریچر نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سودی قرض اور 'تورق' کے ذریعہ تمویل دونوں کا حاصل ایک ہے' کم نقد لے کر زیادہ نقد کا دَین دار یا مقروض ہو جانا۔ عملی زندگی میں نتائج کا انحصار قرض کی سندات اور تمسکات کے پھیلاؤ پر ہوگا' قطع نظر اس کے کہ یہ سندات اور تمسّکات براہ راست سودی قرض کے نتیجہ میں وجود میں آئے یا ادھار خرید اور نقد فروخت کے دو علیحدہ علیحدہ مگر بیک وقت عمل میں آنے والے اقدامات کے نتیجہ میں' دونوں صورتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ جو سند قرض کسی معاملہ کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے اس کے مقابل حقیقی معیشت Real Economy) میں کوئی سامان نہیں ہوتا (جیسا کہ ادھار مال فروخت کرنے یا مرابحہ کی صورت میں ہر قرض کے بالمقابل کوئی سامان ہوتا ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ سندات قرض کی مقدار بڑھتی جاتی ہے اور اشیاء و خدمات کی مجموعی مقدار سے اس کا مضبوط رشتہ نہیں ہوتا۔ سندات قرض خواہ سودی قرض کے نتیجہ میں وجود میں آئیں یا تورق کے عمل کے پہلے قدم کے نتیجے میں' مآل کار ایک ہی ہے۔ مصالح عامہ کا تقاضا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ مقاصد شریعت کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ قمار کی قسم کی سٹہ بازی کے فروغ کا قلع قمع کیا جائے۔ معاشرہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیم میں پائی جانے والی عدم مساوات کو بڑھنے سے روکا جائے اور سرمایہ داروں اور ان کا سرمایہ استعمال کرنے والوں کے درمیان معاملات کو عدل وانصاف کا پابند رکھا جائے۔ (۲۸)۔

جو علماء 'تورق' کے جواز کا فتویٰ دے کر اسلامی مالیات کے حلقہ میں اس کا فروغ کر رہے ہیں ان کو حسب ضرورت ماہرین اقتصادیات کے تعاون سے اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ 'تورق' کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں اسلامی مالیاتی نظام بھی ان ہی نتائج کو سامنے لائے گا جو مروجہ سودی نظام سامنے لا رہا ہے۔ اگر وہ اس پر مطمئن ہوں تو انہیں جزئیات کی بنیاد پر جواز کا فتویٰ دینے کے بجائے کلیات اور مقاصد کی روشنی میں 'تورق' کو ممنوع قرار دینا چاہئے۔

مقالہ نگار یہ سمجھتا ہے کہ جن علماء نے 'تورق' کو جائز رکھا ہے ان کی نظر بعض انفرادی مشکلات پر ہے اور انہوں نے مسئلہ کے اس اجتماعی پہلو پر غور نہیں کیا ہے۔ چند سال قبل ایک ایسی فقہی مجلس میں حاضری کا موقع ملا جس کی صدارت سعودی عرب کے سابق مفتی شیخ بن باز رحمہ اللہ کر رہے تھے۔ شرکاء میں شیخ عبداللہ بن عثیمین' شیخ بکر ابو زید' شیخ یوسف قرضاوی' شیخ صدیق الضریر وغیرہ اکابر علماء شامل تھے۔ مجلس میں 'تورق' کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ شیخ یوسف قرضاوی اور شیخ صدیق الضریر نے عدم جواز کے حق میں دلائل دیے اور آخر وقت تک اپنی رائے پر قائم رہے' مگر مجلس نے کثرت رائے سے جواز کا فتویٰ دیا۔ اس سے پہلے سعودی عرب کے ایک اہم سابق مفتی' شیخ ابراہیمؒ جواز کا فتویٰ دے چکے ہیں' اس کے حوالہ سے شیخ بن باز نے کہا کہ بعض

اوقات کوئی بے چاری ماں اپنی بچی کے علاج یا شادی کے لئے نقد کی ضرورت مند ہوتی ہے اور ہمارے معاشرہ میں کوئی اس کی مدد کو یا قرض حسن دینے کو آگے نہیں بڑھتا اس لئے 'تورق' کی گنجائش باقی رکھنا ضروری ہے' تا کہ اسے ضرورت مند بنکوں سے سودی قرض لینے کے حرام کام سے بچا سکیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض اوقات ایسی ضرورت پیش آ سکتی ہے جو نقد سے ہی پوری ہو سکتی ہے' یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ حالات میں کسی سے 'قرض حسن' ملنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے جو نفع آور کاروبار کے طور پر قائم کئے جاتے ہیں اور جن کو اپنے بے شمار کھاتہ داروں کے مفاد میں کاروبار چلانا ہوتا ہے 'قرض حسن' دینے کی نہ تو اہلیت رکھتے ہیں نہ صلاحیت۔ بنا بریں طلب گاروں کو بوقت ضرورت قرض حسن کی فراہمی ایک اہم اور فوری طور پر توجہ طلب مسئلہ ہے' جسے حل کیا جانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں پہلے سے کچھ تجاویز موجود ہیں اور حال میں بھی نئی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اس مسئلہ پر غور وفکر کے بعد جلد کوئی عملی شکل اختیار کر لینی چاہئے۔

لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے 'تورّق' کا دروازہ کھولنا درست نہیں۔ ہمیں اس بات سے بھی عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ 'تورق' کتنی تیزی سے پھیلا ہے اور اس کے پھیلاؤ کا اثر دوسرے ''اسلامی'' طرق تمویل پر کیا پڑا ہے۔ اسلامی فقہ کا مسلمہ اصول ہے کہ اجتماعی مصالح کو انفرادی مصالح پر ترجیح دی جائے گی۔ تورّق کا جواز بعض ضرورت مندوں کی مشکل حل کر کے انفرادی مصالح کا تحفظ کر سکتا ہے' مگر کلّی سطح پر وہ اسلامی معیشت کو سودی معیشت کی طرح کا بنا کر اُسی جیسی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔

(بشکریہ فکر ونظر' بابت اکتوبر دسمبر 2005ء)